کشمیر میں اردو شاعری

۱۹۴۷ء کے بعد

کشمیر میں اُردو شاعری

سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد

(تحقیقی مقالہ)

محمد یوسف خاں عادل

تقسیم کار:
۱- آل انڈیا ہندی اردو سنگم لکھنؤ (یو-پی)
۲- آل انڈیا ہندی اردو سنگم (شاخ) جموں و کشمیر- سری نگر
۳- شمیم گل پبلی کیشنز- سری نگر ۱۹۰۰۰۲ (کشمیر)

مصنف : محمد یوسف خاں عادل

اشاعت: بار اوّل ۱۹۸۸ء

تعداد: ایک ہزار

سرِورق: سیّد احمد

کتابت: امان مرزا (امروہوی)

قیمت : ۶۰ ساٹھ روپے

طابع : جے۔ آر آفسیٹ پرنٹرس۔ سوئیوالان۔ نئی دہلی ۲

ہماری ریاست کے جانے پہچانے ادیب محمد یوسف عادل نے "کشمیر میں اردو شاعری ۱۹۴۷ء کے بعد" پر جو تحقیقی کام کیا ہے اس کی مقامی ادبی حلقوں میں اشد ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی اس سلسلے میں ابتدائی کوششیں ہوئی ہیں، لیکن ایک مقامی ادیب کی جہاں تک میری اطلاع ہے، یہ پہلی کوشش ہے اور بڑی کامیاب کوشش۔

کشمیر کے کئی اردو شعراء کے بارے میں فاضل مصنّف نے جو کاوشیں اور مساعی کی ہیں، وہ نہ فقط قابلِ توجہ ہیں، بلکہ موجودہ کشمیری محققین کے لئے بڑی حد تک راہ نما بھی ثابت ہوں گی۔!

میں فاضل مصنّف کے حق میں آئندہ کی ادبی کامرانیوں کا خواہاں اور دُعا گو ہوں۔

● پروفیسر شمس الدین احمد
وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی

تعارف

یوسف عادل گذشتہ چند برسوں سے ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں۔ وہ بہت محنت اور لگن سے اپنے تحقیقی کام میں مصروف ہیں۔ یوسف عادل کو میں اس سے قبل سے ایک محنتی اور شائستہ النسان اور ادب دوست صحافی کی حیثیت سے جانتا ہوں، وہ ایک معلّم کے فرائضِ منصبی انجام دینے کے ساتھ ساتھ پرورشِ لوح و قلم بھی کرتے رہے ہیں۔ شعبے سے وابستگی کے دوران وہ بارہا مجھ سے ملتے رہے ہیں اور عصری اردو شاعری کے بعض دشوار اور تشریح طلب نکات پر گفتگو کرتے رہے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ وہ معاصر اردو شاعری کے مسائل و موضوعات سے ناآشنا نہیں ہیں۔ وہ معاصر اردو شاعری کے منظر نامے سے بھی گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی مناسبتِ طبع کے مطابق پی۔ایچ۔ڈی کے لئے "کشمیر میں، اردو شاعری" کے موضوع پر کام کیا ہے۔ اور اب وہ جرأت رندانہ سے کام لے کر اُسے کتابی صورت میں چھپوا رہے ہیں۔ میں ان کو دلی مبارکباد دیتا ہوں۔

عصری شعراء پر قلم اُٹھانا، خاص کر جب وہ بقیدِ حیات ہوں، بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے۔ یوسف عادل کو خود بھی احساس ہے کہ یہ کام خاصا صبر طلب، مُہم جویانہ اور کٹھن ہے۔ لیکن وہ اس مرحلے سے بخیر و خوبی گذرے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شعراء کے تئیں اُن کا رویّہ

مجموعی طور پر تنقیدی کم اور تحسینی زیادہ رہا ہے۔ اُن کی سلامت روی بھی اُن کے تحفظ کا سامان فراہم کرتی ہے۔ تاہم اس میں شُبہ نہیں کہ ریاست کے کئی نسلوں کے شعرار کے حالاتِ زندگی کے بارے میں انھوں نے ضروری مواد جمع کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی شعری خدمات کا بھی ایک تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان کا یہ تحقیقی اور تنقیدی کام مکمل اور جامع نہیں کہلایا جا سکتا۔ اس کی بُنیادی وجہ یہ ہے کہ معاصر شعراء پر، جب کہ ان کا تخلیقی سفر ابھی ناتمام ہو اور جب کہ ان کی ساری تخلیقات منظرِ عام پر نہ آئی ہوں، کوئی حتمی اور مکمل کام نہیں ہو سکتا۔ تاہم یہ کیا کم ہے کہ یوسف عادل کا یہ کام حرفِ آغاز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور یوں اِس کی افادیت مسلّم ہو جاتی ہے۔

مجھے امید ہے کہ یوسف عادل کی یہ کتاب ادبی حلقوں میں پسند کی جائے گی۔!

● ڈاکٹر حامدی کاشمیری
پروفیسر و صدر شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی۔

لائقِ صد ستائش ہے "آل انڈیا اردو ہندی سنگم" جو محمد یوسف عادل کی کتاب "کشمیر میں اردو شاعری کو شائع کر رہا ہے۔ عادل صاحب ایک قابل معلم، محنتی محقق ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین ادیب بھی ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ عادل صاحب جیسے فہیم میری سرپرستی میں معلم کے فرائضِ منصبی انجام دے رہے ہیں اور پرورشِ لوح و قلم بھی کر رہے ہیں۔ میری تمنا ہے کہ زیرِ نظر کتاب ذہن کے بند دریچوں کو وا کرنے کا وسیلہ ہو۔ مجھے یقینِ کامل ہے کہ وطن دوست قارئین، اور ادب دوست طالب علم اسے بہت حد تک پسند کریں گے اور استفادہ کریں گے۔ عادل صاحب اور اردو ہندی سنگم دونوں اس مستحسن کام کے لئے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

● محمد اقبال کھانڈے
(آئی۔ اے۔ ایس)
ناظمِ تعلیمات کشمیر

کشمیر کا ادبی و تہذیبی سرمایہ اتنا وقیع اور قابلِ قدر ہے کہ ادب و تہذیب کے پوشیدہ خزانوں کے متلاشی محققین اور عصرِ حاضر میں زندگی اور ادب میں صالح اور تعمیری قدروں کے حامی دانشوروں کو یہاں روشنی کا ایک سیلاب نظر آتا ہے۔ لیکن بد قسمتی سے اردو زبان کے نقّادوں اور محققین نے اس جانب کم سے کم توجہ کی ہے۔ اس پس منظر میں وادیٔ کشمیر میں شعری و ادبی روایت سے متعلق کوئی کوشش سامنے آتی ہے تو امیدوں کے اَن گنت چراغ جل اٹھتے ہیں۔ نوجوان ادیب و شاعر یوسف عادل نے کشمیر میں اردو شاعری کے موضوع پر میری ہی نگرانی میں اپنا تحقیقی مقالہ سپردِ قلم کیا تھا اور ایسی ھزار ہا پریشانیوں اور مسائل کے باوجود موضوع کے ساتھ انصاف کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ اب یہ مقالہ کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے اور مجھے یقین ہے کہ کشمیر میں اردو شعر و ادب کے طالب علموں کو اس سے خاطر خواہ فائدہ پہنچے گا اور باذوق حضرات بھی کشمیر میں اردو شاعری کی ابتدا و ارتقاء، روایات و رجحانات سے متعلق معلومات حاصل کر سکیں گے۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ یوسف عادل کی یہ تصنیف ہند و پاک کے ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

● ڈاکٹر قدوس جاوید
ریڈر شعبۂ اردو
کشمیر یونیورسٹی۔

"محمد یوسف عادل ایک باصلاحیت ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ تحقیق سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اُن سے اُردو ادب کو بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ زیرِ نظر کتاب اُن ادب نواز حضرات کے لئے دلچسپی کا باعث ثابت ہوگی، جو معاصر شعری ادب کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ اپنے لئے ناگزیر گردانتے ہیں۔

چونکہ اس سے پہلے کشمیر میں اُردو اور بالخصوص کشمیر میں معاصر اُردو شاعری کے موضوع پر مواد نہ ہونے کے برابر تھا —— اس لئے عادل صاحب کا یہ کام قابلِ ستائش ہے۔"

رخسانہ جبین
پروڈیوسر ریڈیو کشمیر
سری نگر

صفحہ نمبر

۱۔ حرفِ اوّل ۱۷

۲۔ باب اوّل :
کشمیر میں اردو شاعری کی ابتدا و ارتقاء۔ ۲۳

۳۔ باب دوم :
کشمیر میں اردو شاعری آزادی کے بعد۔ ۳۳

۴۔ باب سوم :
جدیدیت کے تناظر میں ۱۹۶۰ء کے بعد اردو شاعری۔ ۴۱

۵۔ باب چہارم :
۴۷ء سے ۱۹۶۰ء تک کشمیر کی اردو شاعری ، ۵۷
• اہمیت • انفرادیت • خوبیاں اور • خامیاں۔

۶۔ باب پنجم :
جموں و کشمیر میں اردو زبان و ادب کی صورتِ حال۔ ۶۵

۷۔ باب ششم :
کشمیر کے نمائندہ شعراء۔ ۸۳

۸۔ کتابیات۔ ۱۶۶

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
اپنے لختِ جگر گلِ نوشگفتہ
اعجاز شمیم خان کے نام
جو ہمیں چھوڑ کر سدا بہار پھولوں کی تلاش میں چلا گیا
محمد یوسف خان عادل

حرفِ اوّل

"کشمیر میں اردو شاعری ۴۷ء کے بعد" حاضرِ خدمت ہے۔

شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی کے تحت یہ مقالہ میں نے پری پی۔ایچ۔ڈی ڈگری کے لئے ترتیب دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس موضوع سے متعلق چند مضامین اور جستہ جستہ نوٹس بعض رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ لیکن کشمیر میں اردو شاعری کا بالتفصیل جائزہ ابھی تک نہیں لیا گیا ہے۔ پاکستان میں جناب حبیب کیفوی نے اپنی کتاب "کشمیر میں اردو" میں کشمیر کے اردو شعراء کا ذکر کیا ہے، اسی طرح پروفیسر عبدالقادر سروری نے بھی اپنی کتاب "کشمیر میں اردو" میں کشمیر کے اردو شعراء کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اوّل تو یہ سبھی مطالعے بالعموم آزادی سے قبل یا اس کے آس پاس کے اردو شعراء تک ہی محدود ہیں، دوم آزادی کے بعد شعر و ادب میں پیدا ہونے والے اہم رجحانات کے حوالے سے کشمیر میں اردو شاعری کا جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ اور نہ ہی کشمیر میں اردو شاعری کی ابتداء و ارتقاء کا تاریخی جائزہ ہی پیش کیا گیا ہے۔ میں نے اپنے مقالے میں یوں تو بالخصوص آزادی کے بعد کشمیر میں ہونے والی شاعری کا جائزہ پیش کیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی کشمیر میں اردو شاعری کی ابتدا و ارتقاء سے بھی تاریخی حوالوں کی مدد سے بحث کی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ چندر بھان، میر کمال الدین اندرابی رسوا، میرزا عبدالغنی بیگ قبول اور پنڈت دیارام کاچرو خوشدل کشمیر کے اولین شعراء ہیں۔

مقالے کے دوسرے باب میں کشمیر کی تاریخِ آزادی، کشمیر کی روایتی فرقہ

وارانہ ہم آہنگی، نیشنل کلچرل فرنٹ کا قیام اور ترقی پسند تحریک کی شروعات وغیرہ کے پس منظر میں خاص طور پر مہجور، نادم، ساگر، پردیسی، نازکی وغیرہ کے حوالے سے کشمیر میں اردو شاعری کی ابتدا اور اُس کی خصوصیات کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔

تیسرے باب میں کشمیر میں اردو شاعری پر جدیدیت کے رجحان کے اثرات کے پس منظر میں کشمیر کی جدید علامتی اور استعاراتی انداز کی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ بھی بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جدیدیت کے شور شرابے میں پرانی لیکن مستحکم شعری روایات کی کس طرح کشمیر کے اردو شعرا نے پاس داری کی ہے۔! اس ضمن میں ناصر کاظمی، ساقی فاروقی، سلیم احمد، شمس الرحمن فاروقی کی شعری روایات اور تجربات کے پس منظر میں کشمیر کے اردو شعراء، خصوصاً حامدی کاشمیری، حکیم منظور، ایرج وغیرہ شعراء کی شعری اہمیت سے بحث کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں مقالے کے چوتھے باب میں ترقی پسند تحریک کے عروج وزوال، نئی اصناف کی تشکیل، مختلف ملکی وغیر ملکی زبانوں کی شعری روایات و تجربات سے بحث کی گئی ہے اور اس تناظر میں کشمیر پر فارسی کے غلبہ نیز تاریخی اسباب کی بناء پر اردو کا عروج، اردو اخبارات کا اجراء وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ بھی بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مختلف مشاعروں اور مذاکروں میں مولانا شبلی، فیض، جگر مرادآبادی، جوش اور فراق جیسے شاعروں اور دانشوروں کی بار بار کشمیر آمد کا، کشمیر میں اردو شاعری کے فروغ پر کیا اثر پڑا۔؟ اس ضمن میں کشمیر میں اردو میں تنقیدی اور تحقیقی کام کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور خاص طور پر شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی کے حوالے سے پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر شکیل الرحمن اور پروفیسر حامدی کاشمیری وغیرہ کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی جموں وکشمیر میں اردو کا سرکاری زبان ہونا اور ریڈیو انفارمیشن سنٹر اور

باب دوم

کشمیر میں اُردو شاعری

۱۹۴۷ء کے بعد

Zahoor Hygami
R/o Hygam. Sopore.

NAZIR-KHUSHI-PORI
R/o/HMT.

کشمیر میں اُردو شاعری
آزادی کے بعد

کشمیر آزادی سے پہلے نہایت ابتری اور سیاسی اُتھل پُتھل کا شکار تھا۔ ہر طرف آزادی کے متوالوں کو سامراجی عتاب کا نہ صرف شکار ہونا پڑ رہا تھا، بلکہ کسی بھی خود سری کی سزا موت ہوتی تھی۔ چاہے یہ خود سری تحریر کی موہوم کوشش ہو یا تقریر کی ایک معمولی حرکت۔ ہر صورت میں ڈوگرہ شاہی یہاں کے آزادی پسند ذہنوں کو پامال کرنے پر تُلی ہوئی تھی۔ اندر ہی اندر آزادی کی آگ سُلگتی رہی اور ایک دن اس نے آناً فاناً سامراجی ایوانوں کو بھسم کر ڈالا، حریت کے جیالے مسرت و آزادی کے جام سے سرشار دندناتے پھرنے لگے۔ ان میں معصوم اَن پڑھ لوگ بھی تھے جو نعروں "زندہ بادوں اور اُچھل کود سے اپنی خوشی کا اظہار کر رہے تھے اور ان میں وہ تعلیم یافتہ دانشور اور حریت پسند طبقہ بھی تھا، جس نے کشمیری عوام کے ذہنوں میں حریت کی شمع روشن کی تھی، ان دانشوروں نے اپنی خوشی کا اظہار قلم کی سرمستی سے کیا۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیری ادب یا کشمیر میں اُردو ادب، جو اُس وقت تک پابندِ سلاسل تھا، اب غلامی کی زنجیریں کاٹ کر نہایت آب و تاب کے ساتھ اپنی آزادی کا جشن منانے لگا۔

اِن دِنوں کشمیر سے باہر ایک ایسی آگ لگی ہوئی تھی، جو بُجھائے نہیں بُجھ رہی تھی۔ یہ آگ فرقہ وارانہ فسادات کی آگ تھی۔ لیکن کشمیر چونکہ شروع سے ہی فرقہ وارانہ میل جول اور آپسی بھائی چارے کا گہوارہ رہا ہے۔ اس لئے فسادات کی یہ آگ بانہال کے پہاڑوں کو عبور نہ کر سکی۔ جہاں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ کے شعلے پورے ہندوستان کی صدیوں پُرانی فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور بھائی چارگی کی روایات کو جلا کر راکھ کر رہے تھے، وہیں یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ کشمیر فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے تعلق سے اِس آندھی میں بھی ایک چراغ کی مانند روشنی بکھیر رہا تھا۔ دوسری بات یہ کہ گرچہ فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بانہال کی پہاڑیوں کو عبور نہ کر سکی تھی اور نہ ہی فسادات کشمیر کے دانش وروں اور عوام کا مسئلہ تھے، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ کشمیر کے دانش وروں نے فسادات کی آگ کو اپنی تحریروں کے ذریعے محبت اور بھائی چارگی کی بارشوں سے بُجھانے کی جیسی کوششیں کیں، ویسی کوششیں اُن علاقوں کے دانشوروں نے بھی اتنے خلوص سے نہیں کیں جو فسادات کی آگ میں جل رہے تھے۔ مثال کے طور پر مہجور، آزاد، پریم ناتھ پردیسی اور راما نند ساگر وغیرہ۔

کشمیر کے دانشوروں نے اپنا زورِ قلم ان فسادات کی بیخ کنی پر صرف کیا اور اللہ کا فضل ہے کہ وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ اور ہماری یہ گُل پوش وادی فرقہ پرستی کی آگ سے نہ صرف محفوظ رہی بلکہ یہاں اتحاد و اتفاق کا ایک ایسا نور پھیلا کہ گاندھی جی کو ہند کی گھنگھور کالی گھٹاؤں میں صرف یہیں روشنی کی کرن نظر آئی۔

کشمیر کے ادیبوں نے ایک طرف تو فسادات کے سیلاب کو روکے رکھا اور دوسری طرف نئے کشمیر کے تانے بانے بننے میں اس طرح مصروف ہو گئے کہ باہر مسموم ہوا یہاں آنے سے کترانے لگی۔ کشمیر جو اِن دنوں

آزادی کی نئی نویلی دلہن سے ملاقات کر ہی رہا تھا کہ اِس پر مذہب کے نام پر حملہ ہوا۔ مگر اس نازک موقع پر پھر ایک بار یہاں کے ادیبوں اور شاعروں نے اس حملے کو ناکام بنا دیا اور یہ وادی مذہب کے نام پر بٹنے نہ پائی۔ رفتہ رفتہ حالات "خوش گوار" ہوتے گئے۔ عام لوگوں کے ساتھ ادیبوں اور شاعروں نے بھی "نئے طرز" نئی لہر اور نئے حالات کے تحت چلنا شروع کیا۔ حالات کا تقاضا تھا کہ جو لوگ ڈوگرہ شاہی کی چکی میں پس گئے تھے، اب مساوی انداز میں ترقی کریں، اُن کی سماجی سیاسی، اقتصادی اور فکری زندگی سُدھر سکے۔ اور انھیں تحریر و تقریر کی مکمل آزادی حاصل ہو۔ چنانچہ اس "ضرورت" کو ہر جگہ ہر آن ہر طرف اور ہر ذہن نے قبول کیا اور اس پر سوچنا شروع کیا۔

ان ہی دنوں وادی سے باہر ترقی پسندی کی ایک لہر چل چکی تھی اور یہ لہر سیاسی نعرے کی طرح ہر سمت پھیل رہی تھی اور اپنی فتحمندی کے جھنڈے گاڑے جا رہی تھی۔ جس طرح ہند کی آزادی کی لہر وادی میں وارد ہوئی تھی، اسی طرح نہایت زور و شور اور طمطراق کے ساتھ یہ تحریک بھی وادی میں داخل ہوئی۔ چوں کہ ان دنوں یہاں کے حالات اس تحریک کے لئے نہایت موافق تھے، اس لئے یہاں کے ادیبوں اور شاعروں نے اس تحریک کو والہانہ طور پر گلے لگایا اور نہ صرف اس کا استقبال کیا بلکہ اس کو گھر گھر پہنچانے کا بیڑہ بھی اُٹھایا۔ نوجوانوں کو اس سلسلے میں جو تہذیبی و ثقافتی اور ادبی موڑ دینے کی کوشش کی گئی اُس نے یہاں ایک "نیا" ہی ماحول پیدا کیا۔ اس سلسلے میں نیشنل کلچرل فرنٹ نے بھی بھرپور رول ادا کیا۔ اس فرنٹ کو بعد میں کلچرل کانگریس کہا جانے لگا۔ اس فرنٹ کی کارکردگی اور ترقی پسند لہر کا تذکرہ پروفیسر سرور اپنی کتاب "کشمیر میں اردو" میں اس طرح کرتے ہیں:

"نوجوان ذہنوں کو اس سلسلے میں جو موڑ دینے کی کوشش کی گئی،
اس میں نیشنل کلچرل فرنٹ کا بڑا حصّہ رہا ہے، جسے بعد میں کلچرل کانگریس کا
نام دیا گیا اور اس کی حدود کو وسعت دینے کی کوشش کی گئی۔ اس
حاوی ادارہ کے ماتحت ہر ثقافتی دلچسپی کا ضامن ایک ذیلی ادارہ تھا جو
پروگریسو (PROGRESSIVE) ایسوسی ایشن، تھیٹر ایسوسی ایشن اور آرٹسٹس
ایسوسی ایشن کے نام سے موسوم تھا۔ اس طرح اس مرکزی ادارے نے
ایک نئی تحریک کو اپنے حلقے میں سمیٹ لیا اور ان کو نئی راہیں سُجھا کر اور
ایک نیا آدرش دے کر انھیں تعمیری کاموں میں لگا دیا۔ کشمیر سے باہر
ہندوستان کی وسعت کے لحاظ سے اس کے گوناگوں مسائل نے اگلے دور
کی آزادی کی کشمکش میں شریک نوجوانوں کے لئے ایسا کوئی فورم مہیا
نہیں کیا تھا۔ پچھلے عہد کی جدوجہد میں باہر سے جو قوتیں آزادی کی جنگ لڑنے
والوں کی امداد کر رہی تھیں، وہ اب تعمیرِ نو میں معاون ہونے لگیں۔"

کشمیر میں جو کشمیری ادیب اور شاعر اس ادارہ کی مختلف اکائیوں سے جڑے رہے
اُن میں مہجور، راما نند ساگر، پریم ناتھ پردیسی، عبدالاحد آزاد، نور محمد روشن، دینا ناتھ
نادم، علی محمد لون، عبدالرحمٰن راہی، غلام رسول نازکی، وشوا ناتھ درماں، اختر محی الدین،
بنسی نردوش، امین کامل، غلام نبی فراق، اُمیش کول، تیج بہادر بھان وغیرہ قابلِ ذکر
ہیں۔ باہر کے ادیبوں اور فن کاروں میں جن لوگوں کا تعاون اور مشورہ اس تحریک کو
حاصل رہا اُن میں صلاح الدین احمد، دیوندر ستیارتھی، خواجہ احمد عباس، بلراج ساہنی،
راجندر سنگھ بیدی، ایچ۔ ایس رضا، شیلا بھاٹیہ، پربھاکر، شیو دان چوہان، اچلا سچدیو،
کرنل شیر سنگھ وغیرہ چند نام ہیں۔ ہری سنگھ کی حکومت سے دست کشی اہلِ کشمیر کے لئے دوسری
آزادی کے مترادف تھی، اس مسرت نے گویا گھٹے ہوئے جذبات کے بند کھول دیئے اور
وہ اپنے اظہارِ بیان کے لئے اپنی خواہش کے مطابق راستے تلاش کرنے لگے۔
پچھلا دور جو روایتی دور تھا، جس میں شاعری زُلف کے پیچ و خم اور حُسن کی

چکاچوند میں اپنی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ لیکن آزادی کے بعد شعر و ادب کی نئی جہتیں سامنے آنے لگیں، ادب زندگی کی گتھیاں سلجھانے لگا اور اب یہ انفرادی، اجتماعی اور سماجی تقاضوں کو سمجھنے لگا اور سلجھانے کی فکر میں محو ہو گیا۔ اس "نئے شعور" اور نئی سوچ کا آغاز یہاں اگرچہ ترقی پسند تحریک کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ پھر بھی روایت پسندی یکسر ختم نہیں ہوئی اور نہ دبی۔ روایت پسند ذہن روایت پسندی کو گلے لگائے ہوئے اس میں تنوع لانے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔ گو کہ ترقی پسند تحریک پر پردیسی، اس کے ہم عصر اور ہم خیال دوستوں نے ۱۹۴۱ء سے چلنا شروع کیا تھا، مگر اس تحریک میں جوانی کی لہر آزادی کے بعد دوڑی۔ جب یہاں کے ایک خاص اسکول نے اس کو سیاسی سطحوں پر استعمال کیا اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے۔

یہاں کے نثر نگاروں کے ساتھ ساتھ یہاں کے شاعروں نے بھی اس کارواں میں بھرپور حصہ لیا۔ مہجور ہوں یا آزاد، نادم ہوں یا نازکی، راہی ہوں یا فراق، کامل ہوں یا فانی، عارف ہو یا منظور، پرنمی ہو یا حامدی۔ ہر ایک نے اس میں اپنا خونِ جگر ملایا اور نقشِ خام کو پختہ بنا دیا۔

(کشمیر میں اردو شاعری کی روایت باضابطہ طور پر تقریباً ڈیڑھ سو سال سے زیادہ پرانی نہیں ہے، مگر اس قلیل مدت میں یہاں جس طرح اردو ادب کی آبیاری ہوئی وہ قابلِ ستائش ہے۔) اس نے ترقی پسند تحریک کا بھی ساتھ دیا اور "روایتی" حسن کا دامن بھی نہ چھوڑا۔ جدیدیت سے بھی آنکھیں ملائیں اور تجریدیت کا بھی لبادہ پہنا، علامتی اظہار کو بھی اپنایا اور صوفیانہ و رومانی شعری روایات کی بھی ہم قدم رہی۔ اور آج نئی شعری روایات و رجحانات اور تحریکات سے بھی شانہ سے شانہ ملا کر چل رہی ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جس طرح شروع میں اردو شاعری میں بطورِ خاص مثنوی اور غزل مقبول اصنافِ سخن کے طور پر رائج ہوئیں، اسی طرح کشمیر میں بھی غزل اور نظم نے حرفِ آغاز کا درجہ پایا۔ رفتہ رفتہ ان چیزوں سے ہٹ کر یہاں کے شاعروں نے ترقی پسند تحریک تک آ کر موضوعاتی، معریٰ اور آزاد

نظمیں لکھنے کا رواج بھی اپنایا۔ ۱۹۶۰ء کے بعد جدیدیت نے تمام عالم اُردو کو ہلا کر رکھدیا۔ یہ تحریک ایک طاقت ور رجحان کے طور پر سامنے آئی اور بڑی تیزی سے اُردو ادب کو متاثر کرنے لگی۔ جدیدیت کے اثر سے اردو دُنیا کے دوسرے مراکز کی شاعری میں جس طرح علامتی، تجریدی شاعری کی مثالیں ملتی ہیں اور ابہام پسندی، جنسی اور نفسیاتی موضوعات اور مسائل کا بے باکانہ اظہار ملتا ہے اور نثری نظم و آزاد غزل جیسی کئی نئی اصناف وجود میں آئی ہیں، اِن سب کو کشمیر کی اُردو شاعری نے بھی بڑی حد تک اپنایا ہے، بلکہ ان میں نئے اضافے بھی کئے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ کشمیر کی ان خدمات کو بہت زیادہ سراہا نہیں گیا۔ چنانچہ جناب آلِ احمد سرورؔ نے اپنے ایک مضمون "ریاستِ جموں و کشمیر میں بحیثیت سرکاری زبان" میں کشمیر کی اردو تاریخ کو سمیٹتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے:

> "کشمیر میں فارسی ادب کے اثرات کے علاوہ ۱۹ ویں صدی کے اُردو ادب کے اثرات بھی ملتے ہیں اور بیسویں صدی میں تو یہ اس طرح وسعت اور گہرائی اختیار کر گئے ہیں کہ اُردو ادب کی کوئی جامع تاریخ انہیں نظر انداز نہیں کر سکتی۔ اگر اُردو ادب کی اب تک کی تاریخوں میں کشمیر میں اُردو ادب کے فروغ کو نظر انداز کیا گیا ہے تو یہ قصور ان تاریخوں کے لکھنے والوں کا ہے، اُردو کا نہیں۔"

باب سوم

جدیدیت کے تناظر میں
۱۹۶۰ء کے بعد
اردو شاعری

جدیدیت کے رجحان کے تناظر میں

۱۹۶۰ء کے بعد اُردو شاعری

عصرِ حاضر میں جس قدر تبدیلیاں رُو نما ہوئی ہیں، اُن کا اصل سرچشمہ بہرطور وہ تخلیقی ذہن ہے جو حیات و ممات کے رازوں کو افشا کر کے اُنھیں آج کے عصری حقائق اور مسائل کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ادب کے تعلق سے اشیائے مسائل اور حقائق کو دیکھنے اور دکھانے کے اسی رویّہ کو "جدیدیت" کہتے ہیں۔

جدیدیت کے رجحان نے پُرانی صداقتوں کو نہ صرف نئے معانی عطا کیے، بلکہ نئے معانی دے کر اُنہیں نئی وسعتوں سے بھی ہمکنار کرایا۔ فرسودہ خیالات و تصوّرات کی جگہ، نئے خیالات و تصوّرات نے لے لی۔ یہاں تک کہ ۱۹۶۰ء کے آتے آتے روایتی رومانی شاعری سے کنارہ کشی اور موضوع و اسلوب کی بے جا جکڑ بندیوں سے شاعری کو آزاد کرانے کا رجحان عام ہونے لگا اور رفتہ رفتہ اس رجحان نے کم و بیش ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی اور اس رجحان کو "جدیدیت" کے نام سے یاد کیا گیا۔ لیکن جدیدیت کی معنویت و اہمیت وغیرہ کے بارے میں مختلف و متضاد باتیں کہی گئیں۔ مثلاً نشاط شاہد اپنے مضمون "جدید غزل" میں یوں فرماتے ہیں:

"زندگی اور احساسِ زندگی کی قدیم بنیادوں پر فکر کی نئی شمعیں روشن کرنا انسان کا محبوب مشغلہ ہے۔ فی زمانہ زندگی بے حد تیز، برق رفتار، برق آثار۔ فاصلوں اور سمتوں سے بے نیاز ہو چکی ہے۔"

نشاط شاہد ایک جگہ "جدیدیت" کو سائنسی لائنوں سے یوں ملاتے ہیں:

"سائنس نے تمام پرانی صداقتوں کو یکسر نئے معانی عطا کئے ہیں، اشیاء عوامل اور اسم و افعال اپنا لبادہ بدل چکے ہیں۔ پوری کائنات، تمام تصوّرات مسلسل تبدیلیوں سے ہم کنار ہیں۔"

مخمور سعیدی کے ایک سوال کے جواب میں پروفیسر حامدی کشمیری یوں رقمطراز ہیں:۔

"غالب متشکک ذہن رکھنے کے باوجود "خدائے کہ داشتی داری" کہتے رہے اقبال مشینی تہذیب کی پیش رفت سے روحانی اقدار کی تباہی سے متردّد رہے، فیض سیاسی جبریت کے شاکی رہے۔ فکشن میں پریم چند، کرشن چندر اور بیدی طبقاتی مسائل پر لکھتے رہے اور اپنے دلوں کا بوجھ ہلکا کرتے رہے جدید ادب میں اس کے برعکس مفروضوں، نظریوں اور عقیدوں کے جال سے نکل کر حقیقت کی بیکرانی سے متصادم ہونے کا رویّہ زیادہ ہے مثال کے طور پر وجودی رویّے کے تحت فنکار متخالف کائنات میں اپنے بے مایہ وجود کی آگہی کا کرب جھیل رہا ہے۔ ہاں یہ ادب ان معنوں میں قدیم ادب کی بنیادی اقدار کی بحالی پر زور دیتا ہے کہ یہ معلومات و خیالات کے نظمانے کو نہیں، بلکہ ان کی تخلیقی بازیافت کو اہمیت دیتا ہے۔ شیکسپیئر یا غالب کی عظمت (ادبی رنگ میں) اس بات میں پوشیدہ ہے کہ انھوں نے فن کے تخلیقی کردار کی شناخت کی اور اس کا تحفظ کیا۔ نیا ادب ہر حال میں شعر یا فن کے تخلیقی کردار کے استحکام پر زور دیتا ہے۔"

جدید ادبی رجحان کے تحت موضوعات عصری تقاضوں کے پیشِ نظر زیادہ تہہ دار ہو گئے، خیالات کے تہہ در تہہ ہونے سے ایک تو زبان و بیان کی چستی پیدا ہوئی اور

کارآمد درد لبست وجود میں آئے۔ معنی خیزی نے تہلکہ مچا دیا، بصری پیکروں کا عام استعمال ہونے لگا۔ ایک طلسمی فضا پیدا ہوئی، عصری انسانی صورتحال کا اظہار عام ہونے لگا۔ پیکر تراشی، طلسمی صورتِ حال، استعاراتی اظہار، احساسات کی بازیافت، زبان و بیان میں خودردی، سادگی اور سہولت کے عناصر، انفرادیت کے کئی عناصر، زخمی روح کا پھڑپھڑانا اور ایسے کئی محرکات ہیں جو جدیدیت کے رجحان میں اس طرح سمودئے گئے ہیں کہ اب یہ اس کا جزوِ لاینفک بن چکے ہیں۔ ان محرکات و انسلاکات نے جدیدیت کے رجحان کو نہ صرف زندگی بخشی، بلکہ اس میں ایک نئی روح بھی ڈال دی۔ آج جدیدیت اگرچہ بے کراں ہوگئی ہے مگر معنی اور ہیئت کے اعتبار سے اس میں وہ تمام عناصر موجود ہیں، جن سے شاعری لازوال اور بے مثال بن جاتی ہے۔ روح کا دباد باسا احتجاج اور انفرادیت کے خول میں ان گنت "سرمایہ" جدیدیت کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ ان سے ہماری شاعری میں جمود کی کیفیت ختم ہوئی اور شاعر زُلف وخال سے نکل کر اپنے تن و من کی آواز جان سکا۔ نشاط شاہد نے بجا طور پر اسے "اصل تخلیقی ذہن کا سرچشمہ" بتایا ہے۔[۱] اس سے کئی نئے باب کھل گئے ہیں اور کئی نئے امکانات سامنے آئے ہیں۔ آیئے اب ذرا جدید شاعری کی اصطلاح کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

شاعری کے سلسلے میں "جدید[۲]" کی صفت بطور اصطلاح ہمارے یہاں اس وقت استعمال میں آئی جب آزاد اور حالی نے شعوری طور پر مقصدی، اصلاحی اور افادی قسم کی نظمیں لکھنے اور اس رجحان کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ اس وقت سے لے کر کچھ عرصہ پہلے تک جدید شاعری کے جتنے رجحانات سامنے آئے، ان کے پیچھے زمانۂ حاضر سے متعلق کسی نہ کسی قسم کے نصب العین کا تصور کارفرما رہا ہے، بعض اوقات ایک رجحان دوسرے رجحان کی ضد یا ردِعمل کے طور پر وجود میں آیا ہے، لیکن اس کے علمبرداروں نے بھی اپنے رجحان کو ایک مسلک یا نصب العین کی شکل دینے کی کوشش کی ہے، اس لئے اس دور کی جدید شاعری اپنی تمام منزلوں اور مرحلوں میں اپنے مسلک یا نصب العین سے ہی پہچانی

---

[۱] "جدید غزل" از نشاط شاہد۔ ص ۹ [۲] "جدید غزل" از خلیل الرحمٰن اعظمی ص ۱۲

جاتی رہی ہے۔

یہاں اعظمی صاحب نے نصب العین پر زیادہ زور دیا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ وہ نصب العین کو ہی منتہائے مقصد مان لیتے ہیں۔ لیکن یہ اپنی جگہ حقیقت ہونے کے باوجود سب کچھ نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا شاعر نصب العین کے بغیر رہ سکتا ہے؟ اگر رہ سکتا ہے تو کیونکر؟ یا اگر نصب العین کے ساتھ ہی رہ سکتا ہے تو کیا وہ نصب العین ایک جیسا رہ سکتا ہے، کیا وہ پرانا نہیں بن سکتا؟ آج کے اقدار، کل کے فضولیات بھی ثابت ہو سکتے ہیں اور نہیں بھی ہو سکتے۔ میرے خیال میں نصب العین کسی حد تک ضروری تو ہے لیکن شرط لازم نہیں۔ فن کار جس سماج میں رہتا ہے اس سے نباہ بھی کرتا ہے اور کبھی بغاوت بھی۔ وہ اپنی انفرادیت بھی بچانا چاہتا ہے اور اپنے ادراک کو آزاد بھی رکھنا چاہتا ہے۔ وہ خارجی عوامل سے بھی گزرنا چاہتا ہے اور داخلی واردات سے بھی ملنا چاہتا ہے ان تصادمات سے بچنے کے لئے وہ ایک نئی فضا قائم کرتا ہے اور اس کو اپنے لئے محفوظ بھی سمجھتا ہے۔ غرض نصب العین بھی ضروری ہے اور نصب العین فرسودہ نہ ہو جائے اس لئے ایک نصب العین سے چمٹے رہنا مناسب نہیں۔ مقررہ سانچوں اور بنائے ہوئے راستوں پر چلنے یا نہ چلنے سے بہتر یہ ہے کہ ہم ان کو نئے معانی سے تعبیر کریں اور سمتوں پر چلا کر ایک آفاقی وسعت عطا کریں۔

انگریزوں نے ہندوستان میں نئی تعلیم، نئی تہذیب اور نئی فکری صورتوں کو جنم دیا۔ ان سے ہمارے شاعروں کے ذہنوں میں نیا طلاطم پیدا ہوا، ان کی ادہام پرستی، مافوق الفطرت قوتوں پر یقین، رندی اور دیوانگی کے تصورات یکسر ختم ہونے لگے، انھوں نے مثبت پہلوؤں اور حقائق سے بھرپور زندگی پر سوچنا شروع کیا۔ سوچنے کا یہ انداز پیچیدہ کبھی نہ رہا، بلکہ اُسی انداز میں پیش کیا گیا، جس طرح محسوس کیا گیا۔ شاعر نے اپنی زندگی کی تلخیوں اور ناہمواریوں کو ردِ عمل کے طور پر پیش کیا۔

جدید شاعری کا یہ مطلب بھی نہیں لیا جا سکتا کہ اس کے تحت شاعر ہمیشہ مفید، صحت مند اور کامیاب فن پاروں کو ہی جنم دے سکتا۔ بلکہ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ

جدید فن پارے کبھی کبھی غیر اعتمادیت کا شکار بھی ہو جاتے ہیں۔ دراصل محض نقالی سے فن میں پختگی نہیں آتی۔ پختگی کے لئے ریاض اور سخت مشق کی ضرورت ہے اور جب تک شاعر مسلسل اور مدلل کوشش نہیں کرتا اس کا فن، فن نہیں کہلا سکتا، چاہے وہ کسی بھی رجحان سے منسلک کیوں نہ ہو۔ جدید شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُس نے فارموں اور خانوں سے اپنے آپ کو آزاد رکھا ہو اور وقتی نصب العین بھی نہ اپنایا ہو، اور نہ ہی وہ نفی و اثبات کے سانچے و کسوٹی کے طور پر استعمال ہوتی ہو۔ وہ دراصل اپنے مافی الضمیر کی دریافت میں مصروف ہوتی ہے اور جب تک وہ زندگی کی حقیقتوں سے آنکھ نہیں ملاتی، چین سے نہیں بیٹھتی۔ زندگی چونکہ غم و اندوہ، امیدی ناامیدی، خوشی نفرت و محبت، ہجر و وصال، اور قربت و دوری سے عبارت ہے، اس لئے یہ ایک ہی کل نہیں بیٹھ سکتی۔ اس میں اُبال آنا لازمی ہے۔ اس پیچیدگی سے کھیلنے میں جدید شاعری کو لُطف آتا ہے۔ جدید شاعری میں یہ بھی خصوصیت ہے کہ اس کو ہم کسی مخصوص خانے میں قید نہیں کر سکتے، اور نہ ہی اس پر کوئی لیبل چسپاں کر سکتے ہیں۔

"نئے شاعر نے واعظ ہی نہیں عاشق، رند، رومانی، باغی، مبلغ، مجاہد انقلابی اور اشتراکی سب کے نسب نامے کو پھر سے ایک بار آدم کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی ہے اور آدمی کے چہرے سے اوپری خول اُتار کر اس کے باطن میں جھانکنے کی کوشش کی ہے۔"[۱]

زندگی کے لاتعداد مسائل مرکزیت و اولیت کو سمجھنا اور سمجھ کر پرکھنا اور پھر اس کو فن کے سانچے میں ڈھالنا، جدید شاعری کی دین ہے۔ یہی خیال نئی شاعری کے طرف دار ظاہر کرتے ہیں۔ آج کا شاعر ایک چیز، ہر ایک واقعے اور ہر ایک جذبے کو انسانی عقل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتا ہے اور پھر اس کو برملا اور

---

[۱] "معیار" از خلیل الرحمٰن اعظمی صہ ۱۹

بیباک انداز میں لفاظیت کی علت کے بغیر پیش کرنا چاہتا ہے۔ یہ کہنا بھی صحیح ہوگا کہ وہ اپنے باطن میں جھانکنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اندرون کو بیرون سے ملاکر نئی جہتیں پیدا کرتا ہے۔ جذبات اور محسوسات کو ہو بہو اسی طرح ادا کرنا چاہتا ہے، جس طرح اُسے "اندر کا آدمی" اُکساتا ہے۔

"جدیدیت کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عقلیت اور غیر عقلیت ہم آمیز ہوگئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدیدیت ٹیکنالوجی کے استعمال کی تائید بھی کرتی ہے اور مذمت بھی۔ جہاں وہ کلچر کے پرانے دور کے خاتمے کا اعلان کرتی ہے، وہیں تاریخیت اور وقت کے دباؤ کی موجودہ کیفیت سے خوفزدہ بھی ہے۔ یہ رویّہ اُسے فطرت نگاری، عقلیت پسندی، حقیقت پسندی اور رومانیت سے ممیز کرتا ہے۔"[۱]

جہاں تک عقلیت اور غیر عقلیت کے ہم آمیز ہونے کا سوال ہے، یہ حقیقت ہے کہ کبھی کبھی جدیدیت، عقلیت سے ذرا دور بھی ہوجاتی ہے۔ مگر یہ صورتحال زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی، بلکہ ایسا ہونا ایک وقتی اُبال ہے اور اُبال چند پلوں کا مہمان ہوتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا ذرا اچھا نہیں لگتا کہ جدیدیت، غیر عقلیت میں پائی جاتی ہے۔ اگر جدیدیت غیر عقلیت یا محض "خیالی محوروں" کے گرد گھوم گئی ہوتی تو کب کی یہ فرسودہ ہوچکی ہوتی۔ اس میں شروع سے آخر تک عقلیت ہی عقلیت نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدیدیت نے "خیالی دُنیا" کو حقیقی دنیا کے سامنے لاکر ایک طرح سے ننگا کردیا ہے۔ رہی بات وقت کے دباؤ کی موجودہ کیفیت سے خوفزدہ ہونے کی، تو میرے خیال میں خوفزدہ وہی ہوتا ہے جو شعوری طور پر چلتا ہو، اور شعوری طور پر عقلیت کے پاسبان ہی چلتے ہیں۔ اس لئے خوفزدہ ہونا عقلیت کے شریکِ کار ہونے کی دلالت ہے۔ بالفاظ دیگر یہ عقل ہی ہے جو انسان کو مستقبل کے لئے اعتماد کی لوریاں سُناتی ہے یا خوفزدگی پیدا کرتی ہے، میرے خیال میں جدیدیت میں غیر عقلیت

---

[۱] "جدید اردو غزل" از مغنی تبسم۔ ص ۴۳

کا گزر بہت ہی دشوار ہے۔

انیسویں صدی کے اواخر میں مغربی نقّادوں نے متفقہ طور پر یہ اعلان کیا کہ یہی جدیدیت کا زمانہ ہے، مگر جدیدیت کے مفہوم کے بارے میں ان میں اتفاق رائے نہیں ہو پایا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے سامنے یہ ہر عہد میں بدلتی رہی اور اس کے مفہوم بھی بدلتے رہے، کہیں اسے حقیقت نگاری کہا گیا تو کہیں تاثریت (IMPRESSIONISM) کہا گیا۔ ایک طرف سے (CUBISM) مانا گیا تو دوسری طرف (SYMBOLISM) کے طور پر پیش کیا گیا۔ غرض ذہن کی آزادانہ روش کو چاہے وہ تاثراتی ہو یا رمزیہ ہو یا ماورائی ہو، جدیدیت سمجھا گیا۔ حالی نے جس کے بیج بودئے تھے اور اقبال و فراق نے جس کو جہتیں عطا کیں، بعد کے شاعروں نے اس میں نئے تجربوں سے نئی نئی وسعتیں پیدا کیں۔

"ہاں خوشی کا یہ مقام ہے کہ فن کار نے حقیقت سے کام لے کر دُوربینی کی کامیابی سے اس کو آگے بڑھایا، اور آگے بڑھانے کی دوڑ ابھی بھی قائم ہے۔"[1]

آیئے! اب ذرا "جدیدیت" کے علمبردار شعراء کے کلام کو دیکھیں اور اُسے سمجھنے کی کوشش کریں تاکہ جدیدیت مثالوں سے خود بخود آشکار ہو جائے۔ روایتی غزلوں میں ہمیشہ محبوب کو ستم گر اور عاشق کو ستم رسیدہ دکھایا گیا، لیجئے نئی حقیقت سے بھی آنکھیں ملایئے! جہاں محبوب کو بھی ایسی کیفیتوں سے دوچار دکھایا گیا ہے، جو آج تک صرف عاشقوں کے ہی نصیب میں لکھی ہوتی تھیں:-

تو کون ہے، تیرا نام ہے کیا
کیا سچ ہے کہ تیرے ہو گئے ہم

(ناصر کاظمی)

---

[1] کم و بیش نشاط شاہد، ناصر کاظمی، خلیل الرحمٰن اعظمی، اطہر پرویز اور ڈاکٹر حامدی کاشمیری، پروفیسر آلِ احمد سرور اور ڈاکٹر عبداللہ لاہوری سب اس کی تائید کرتے ہیں، صرف احتشام حسین اس سے ہٹ کر سوچتے ہیں۔

آگے آگے کوئی مشعل سی لئے چلتا تھا!
ہائے کیا نام تھا اس شخص سے پوچھا بھی نہیں
(شاذ تمکنت)

نہ جس کا نام ہے کوئی، نہ جس کی شکل ہے کوئی
ایک ایسی شے کا کیوں ہمیں ازل سے انتظار ہے
(شہریار)

آج کی غزل میں ماحول، فطرت اور اس کے مظاہر علامت بن کر سامنے آتے ہیں:

بین کرتی ہے دریچوں پر ہوا　　رقص کرتی ہیں سیہ پرچھائیاں
(سلیم احمد)

چلا ہے مجھ سے آگے مرا سایہ　　سو میں بھی ساتھ چلتا جا رہا ہوں
(سلیم احمد)

رین اندھیری ہے اور کنارہ دُور　　چاند نکلے تو پار اُتر جائیں
(ناصر کاظمی)

فصیلِ جسم پر تازہ لہو کے چھینٹے ہیں!　　حدودِ وقت سے آگے نکل گیا ہے کوئی
(شکیب جلالی)

ایک مدت سے چراغوں کی طرح جلتی ہیں　　ان ترستی ہوئی آنکھوں کو بجھا دو کوئی
(ساقی فاروقی)

مختصراً اتنا کہنا کافی ہے کہ جدیدیت تب کھُل کر سامنے آئی ہے، جب یہ زمانے کی روح سے ہم آہنگ ہو کر تازگی پیدا کرتی ہے۔ زمانے کی دیواروں میں وہ قید نہ ہو تاکہ آنے والا کل اُسے "باسی" نہ سمجھے اور پُرانی نہ ہو جائے۔ اس کا باطن آفاقی روح سے ہم آہنگ ہو جو شاعری کو ہر دور میں "زندہ" رکھے اور مقامِ جاوداں دے۔ یہ رہی ملک گیر جدید شاعری کی صورتحال، اب ذرا اس کے تناظر میں کشمیر کی اردو شاعری ۱۹۶۰ء کے بعد کا جائزہ لیں:۔
کہا جاتا ہے کہ جدیدیت ۱۹۶۰ء کے بعد شروع ہوئی۔ لیکن میں کشمیر کے کئی مقتدر شعراء سے

ملا، اُن کا کلام دیکھا اور اس کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ کشمیری شاعروں نے بھی جدیدیت کو شروع میں ہی اپنا لیا تھا اور اس میں نت نئے تجربے کئے تھے۔ جدیدیت ہند میں ۱۹۶۰ء کے بعد ہی نظر آئی، جبکہ یہاں (کشمیر) کے اکثر شعراء کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سارے ملک سے پہلے جدیدیت کو نہ صرف اپنا لیا تھا بلکہ اس میں مختلف النوع کے تجربوں تک بھی آگئے تھے۔ آیئے ذرا ان مثالوں کو دیکھیں جو اس سلسلے میں پیش کی جا سکتی ہیں۔

(۱)

جاگتے لمحوں میں تلخابۂ شیریں کے سبو　　　رات کا دل بھی نگلتا ہے ہمیشہ جادو

(۲)

تلخیٔ زیست کے اسباب پہ انگلی رکھ دوں　　　اپنے آقاؤں سے دو چار سوالا کردوں

(۳)

کر رہا ہوں طے خلا کے راستے　　　پھر بھی جنوں میرا بے سود ہے

(۴)

بدلنا ہے مجھے اے عرشؔ زندگی کا نظام　　　بلا سے لاکھ رسوم کہن کے پہرے ہوں

(۵)

مئے فریب و دغا اب مجھے درکار نہیں　　　مئے خلوص و وفا سے بھرا ہے دل کا جام

(۶)

برقِ جمالِ طور سے بے خود ہوئے کلیمؑ　　　میں کھیلتا ہوں ایسے نظاروں سے رات دن

(۷)

ہستی کے تقاضے نا واجب!　　　ایمائے اجل بے ہنگم ہے
کچھ ربط دماغ و دل میں نہیں　　　اے مشقِ سخن اب کیا ہوگا

(۸)

خونبار شفق ہے، کیا جانے　　　کتنوں کا سہاگ اُترا دن میں

۱۔ قیصر قلندر ۲۔ راہی ۳۔ مہندر رینہ ۴، ۵۔ عرش ۶۔ عاجز ۷۔ شہزور (۱۹۶۰ء سے پہلے کا کلام)

ہے شام کے سر پر کالا کفن اے شب کی دلہن اب کیا ہوگا

(شہزور)

(۹) دل کے دروازے پہ دستک دے رہا تھا کون تھا
جھانک کر دیکھا کوئی چہرہ، کوئی پیکر نہ تھا

(ایرج)

قطع نظر اس کے کہ یہ مثالیں پوری کی پوری "جدیدیت" کی کسوٹی پر کھری اُترتی ہیں یا نہیں، یہ بات مسلمہ ہے کہ ان سب میں جدیدیت کا مزاج پایا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ۶۰ء سے کچھ سال ہی پہلے جدیدیت کا رُجحان کشمیر میں پلا، بڑھا اور جوان ہوا۔
۱۹۶۰ء سے جو ملک گیر ادبی فضا قائم ہوئی اُس کو جدیدیت کا نام دیا گیا۔ اس کے تحت مُلک گیر پیمانے پر ادب میں نئے موضوعات اور نئے اسکول کُھلنے شروع ہوئے۔ ملک بھر کے ادیبوں اور شاعروں نے نئے راستوں پر چل کر نئی سمتوں کی نشاندہی کی اور کشمیر کا ادیب و شاعر بھی ان تبدیلیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ طرح طرح کی ادبی سرگوشیاں شروع ہوئیں۔ یہاں کے نئے اور پُرانے شاعروں نے بھی "حالات" کے پیشِ نظر اپنی سوچ، اپنی فکر اور اپنے لہجے میں تبدیلی پیدا کی۔ جذباتیت اور "نعرہ بازی" کو خیرباد کہا گیا۔ اُس کی جگہ حقیقت پسندانہ لائنوں پر سوچا جانے لگا۔
یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ ان دنوں تمام ملک کی اردو شاعری سیاسی اور فکری انقلاب سے دوچار تھی۔ اس لئے کشمیر میں بھی اس نے ان انقلابات کو جگہ دی بلکہ اس کی تمام ترجہتیں منظرِ عام پر لانے کی کوششیں کیں۔ روایتی اور رومانی شاعری کا چلن ختم ہوا، اس کی جگہ اُسلوب کی جکڑبندیوں سے آزاد ہو کر ایک نئی وسعت اختیار کر گئی۔ موضوعات، عصری تقاضوں کے پیشِ نظر زیادہ پُر معنی اور تہہ دار ہو گئے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے جس شاعر نے یہاں شروعات کی اُس کا نام نامی حبیب اللہ حامدی کاشمیری ہے۔ اس طرح یہ کہنے میں کسی پس و پیش کی ضرورت نہیں کہ حامدی کاشمیری ہی کشمیر میں جدیدیت کے بانی مبانی ہیں۔ اس لئے کہ اُن سے پہلے جن شعراء نے جدیدیت

پر سوچنا شروع کیا تھا۔ وہ پورے طور "پر حقیقت پسندانہ نہیں دکھائی دیئے۔ اس ضمن میں جناب منیب الرحمٰن کی یہ رائے مستحسن اور معتبر قرار دی جا سکتی ہے کہ:

"نئی شاعری کے سلسلے میں جس کی ابتدا ریاست میں ۶۵ء[1] کے بعد ہوئی، حامدی کاشمیری نے پیش رفت کی۔ روایتی رومانی شاعری نے کنارہ کش ہو کر انہوں نے موضوع اور اسلوب کو بے جا جکڑ بندیوں سے آزاد کرا کے نئے شعری تقاضوں کے مطابق کر دیا۔ ریاست کی نئی اردو شاعری کے نمائندہ شعراء کی فہرست میں حامدی کاشمیری سب سے آگے ہیں۔"

یہ حقیقت ہے کہ حامدی کاشمیری ریاستِ جموں و کشمیر میں جدید شاعری کے ہراول دستے میں نظر آتے ہیں، اُن کا منفرد اسلوب "جو نایافت"[2] سے ظاہر ہے ان کی وسعتِ نظری اور "دل کے سفر" کا ہمسفر ہونا نہ صرف اُن کو جدید شاعروں کا نمائندہ شاعر بناتا ہے، بلکہ اُن کو "نئے راستوں" کا پیامبر بھی بنا دیتا ہے۔

حامدی صاحب ایک مخصوص شعری اظہار کے لئے ملک بھر میں منفرد مقام رکھتے ہیں، حامدی صاحب کے پاس اگرچہ موضوعات کی زیادہ فراوانی نہیں، مگر ان میں طلسمی صورتحال تخلیق کر کے وہ انفرادیت میں کھو کر پیکر تراشی اور استعاراتی اظہار کو جنم دیتے ہیں۔ وہ قدرت کی بنائی ہوئی چیزوں کو اس طرح علامتی لباس پہناتے ہیں کہ وہ چیز ساکن ہو کر بھی متحرک لگتی ہے۔ وہ شعروں میں "تخلیق کرنے کے روادار ہیں "تحیر انکی تخلیق کردہ طلسمی دنیا کا اہم عنصر ہے"[3] وہ عصری اظہار کے ہر پہلو پر نظر رکھتے ہیں اور نتیجے کو بر ملا کہہ دیتے ہیں۔ حیات کی بے ثباتی، کھوکھلا پن اور بے معنویت ان کے اشعار میں اکثر ہویدا ہوتی ہے۔

پرندے اب کہاں وحشت نوا ہیں!　　　وہ لے آئیں گے زیرِ دام کس کو

---

[1] ۔ یہ درست نہیں ہے۔ یہاں (کشمیر) میں تو ۶۰ء سے بھی پہلے نئی شاعری کا اتہ پتہ ملتا ہے۔

[2] ۔ حامدی کاشمیری کا شعری مجموعہ۔

[3] ۔ "نئی شاعری" از منیب الرحمٰن (تعمیر) کا جموں و کشمیر ادب نمبر۔ اگست ۸۳ء)

کتنے سورج تہوں میں اترے تھے　　فصلِ انجم سمندروں میں نہیں

بصری پیکروں کا استعمال اور اُن سے معنی خیزی کی تخلیق حامدی صاحب کا محبوب مشغلہ ہے۔

لاکھ کہتے رہے اس دیس کا کچھ حال لکھو　　تکتے تھے چہروں کو آمادۂ گفتار نہ تھے

⁂

ردائے برف میں سنگ و شجر ہوئے روپوش　　وہ عیش گاہوں میں کیا کیا گناہ کرتے رہے

⁂

نکل آئے ہو تہہ خانوں سے آخر　　کہو تم میں ہوا الہام کس کو

غرض ان کی شاعری، عصری زندگی کی ستم سامانیوں کے شدید احساس کی روداد ہے۔ ان کے بعد جدید شاعروں کی دوسری صف میں یہاں[۱] مندرجہ ذیل شعرا نظر آتے ہیں، جنہوں نے روایتی اور رومانی شاعری کے ساتھ ساتھ جدید شاعری کے مزاج کو بھی قبول کیا اور اس میں نئی سمتوں پر آگے ہی آگے رواں دواں ہوئے۔ جدیدیت کی اس صف میں حکیم منظور، مظفر ایرج، شجاع سلطان، مسعود ساموؔن، رخسانہ جبیںؔ، واجدہ تبسمؔ، رفیق رازؔ وغیرہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

کشمیر کی جدیدیت کی تحریک پر نور شاہ اپنی کتاب "انتخابِ اُردو ادب" میں یوں رقمطراز ہیں:

"اردو لکھنے والوں پر ان نئے تقاضوں کا براہِ راست اثر ہوا اور اُن کی تخلیقات بھی اپنے نئے تقاضوں کا ساتھ دینے لگیں۔ اِس دوران کہنہ مشق لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ کچھ نئے نام سامنے آنے لگے، اِن میں خاص طور پر قابلِ ذکر فاروق نازکی، فرحت گیلانی اور صادق علی اسیر ہیں۔"[۲]

---

[۱] مراد جموں و کشمیر ہے

[۲] "انتخابِ اردو ادب" از نور شاہ

"ایوانِ اردو" میں یوسف ٹینگ صاحب کشمیری ادیبوں کی پذیرائی کا اس طرح ذکر کرتے ہیں:

"ایوانِ اردو میں موجودہ دور کے کشمیری ادیبوں کی پذیرائی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ جدیدیت کی لَے اُردو میں تقریباً بیک وقت ساری جگہوں پر سُنی گئی اور اس کی بازگشت بھی ہر جگہ ہوئی۔"[۵]

آیئے اب ہم "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر آپ کو کشمیر کے جدید اُردو شاعروں کے کچھ اشعار سُناتے ہیں، جن کو ہم فخریہ طور پر اُردو کے بڑے ایوانوں میں پیش کر سکتے ہیں۔ یہ اشعار نہ صرف جدیدیت کا مزاج و لباس اور عصری عناصر رکھتے ہیں، بلکہ ان سے جدیدیت میں نئی جہتیں اور سمتیں منظرِ عام پر آئی ہیں۔

(۱)

ریت میں کھو جانے سے پہلے وہ پلکیں کھولتے
دشت میں بھی خواب آسودہ صنوبر دیکھتے

(۲)

پھر چاہتے ہوئے بھی میں واپس نہ آسکا
دریا جب اپنے ساتھ بہالے گیا مجھے

(۳)

حدت اتنی سوزِ نہاں کی
جلتی آگ نے کھائی مات

(۴)

وہ سویا سنگ سنگ ارادوں کو اوڑھ کر
اور مجھ کو آنکھ آنکھ بکھرنا ہے رات بھر

۵۔ پیش لفظ "کشمیر میں اردو"، یوسف ٹینگ

(۵)

کروں گی میں چراغاں ترے جزیرے کو
مرے صدف کے مقدّر میں تو سیاہی لکھ

(۶)

میں اپنے اندر شریر لڑکا لئے چلا ہوں
میرے قریب وجوار میں کیا نمائشیں ہیں

(۷)

خاموشیوں کے زرد تکلّم سے ڈر کے وہ
اک ان سُنی صدا کا طرفدار بن گیا

(۸)

اِک دھوپ کی جادوگری ہے، پانی پر نقش بناتی ہے
دیکھو تو یہ دُنیا سب کچھ ہے، سوچو تو یہ دُنیا کچھ بھی نہیں

(۹)

اُسی کے ذکر سے روشن ہیں بام و در اپنے
اگر سُنے گا تو سب روشنی بجھا دے گا

۱۔ حامدی کاشمیری ۲۔ پرتپال سنگھ بےتاب ۳۔ نشاط انصاری ۴۔ مسعود سامون
۵۔ رخسانہ جبیں ۶۔ خالد بشیر ۷۔ حکیم منظور ۸۔ محمد یٰسین ۹۔ شجاع سلطان

باب چہارم

۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۰ء تک کشمیر کی اردو شاعری

* اہمیت
* انفرادیت
* خوبیاں
* خامیاں!
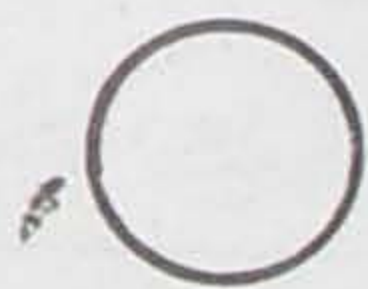
۱۹۴۷ء تا ۱۹۶۰ء کے دوران

کشمیر کی اُردو شاعری کی اہمیت،

انفرادیت، خوبیاں اور خامیاں!

"آزادی اور اپنی قسمتوں کے مختار آپ ہونے کے احساس کے ساتھ ساتھ اپنی زبانوں[2] کی طرف توجہ ایک فطری بات ہے۔ یہ احساس کشمیر میں پچھلے عہد سے بیدار ہونے لگا تھا، جس کے آثار مہجور اور اُن کے ہم عصر کچھ شاعروں کے یہاں ملتے ہیں۔"[1]

یہ حقیقت ہے کہ آزادی نہ صرف سیاسی، سماجی اور اقتصادی آزادی لاتی ہے، بلکہ اس سے فکر و فن میں بھی ایک انقلاب آتا ہے۔ کشمیر کی آزادی نے جہاں لوگوں کو پسماندگی سے اُٹھانے کی کوشش کی، وہیں یہاں کے ادیبوں نے مشترکہ طور پر ایک ایسی سعیٔ پیہم کی جس سے یہاں کے ذہنوں پر طاری جمود ختم ہوا اور "نئی صبح" کی خوشگوار کرنیں منظرِ عام پر آئیں۔ حکومت کی طرف سے اپنی اپنی زبان کو سجانے اور سنوارنے کے لئے حوصلہ افزائی کے مراکز[3] قائم ہوئے، ان سینٹروں نے ممکنہ حد تک یہاں کے ادیبوں کو مالی معاونت سے نہ صرف نوازا بلکہ ان کی نئی تخلیقات کے ذریعے، نئے ادب کو بھی عام کیا۔ کشمیر کے ادیبوں

---

[1] "کشمیر میں اردو" از پروفیسر عبدالقادر سروری ص ۲۳ (جلد ۳)

[2] ۔ مراد کشمیر کی مختلف زبانیں۔

[3] ۔ یعنی کلچرل اکیڈمی، محکمۂ تعلقات عامہ و اطلاعات۔

نے کشمیری زبان میں بھی لکھنا شروع کیا اور اتنا لکھا کہ صدیوں کی کسر نکالی۔
اسی طرح جموں کے ڈوگری ادیبوں نے ڈوگری شعر و ادب میں بیش بہا اضافے کئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کشمیر میں "کشمیری" اور جموں میں "ڈوگری زبانیں ننھے پودوں سے تناور درختوں میں مبدل ہوئیں۔

"لیکن اس دور میں بھی کئی باہمت اہلِ قلم نے اردو کی وسیع تر ادبی دنیا میں اپنی مخصوص ذہانت اور فن کے نقش بٹھائے اور جو کل ہند ادبی تصویر میں اپنے موقلم کی رنگ کاری کی شانِ عمل کو نمایاں کرنے میں اب بھی مصروف ہیں۔"[1]

ان باہمت قلم کاروں نے روایتی، رسمی اور رومانی دنیا سے ادب اور فن کو نکالنے کی کوشش کی اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔ انفرادی، سماجی اجتماعی تقاضوں سے زندگی کی گرہیں کھولنے پر زور دیا گیا۔ اگرچہ اس دور میں بھی روایت کا پاس و لحاظ باقی رکھا گیا، مگر زیادہ جھکاؤ ترقی پسندی کی طرف رہا۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں پردیسی نے یہاں[2] ترقی پسندی کی بنیاد ڈالی۔ مہجور، ساگر، نادم[3] اور دوسرے ادیبوں نے اُن کا ساتھ دیا۔

اس طرح ترقی پسند تحریک شد و مد سے رواں دواں ہوئی۔ اس تحریک کا زور جب سنہ ۱۹۴۶ء میں ذرا کم ہوا تو یہاں کے ادیبوں نے "حلقہ اربابِ ذوق" کا قیام عمل میں لایا۔ اس حلقے نے ادب اور فن کو کئی شعبوں میں تقسیم کر دیا۔ نتیجے کے طور پر کئی تھیٹریکل انجمنیں اور کلب معرضِ وجود میں آئے۔ بعد میں یہ حلقہ اربابِ ذوق، انجمن ترقی پسند مصنفین میں مدغم ہو گیا اور اس ادغام کے بعد جلسوں اور مشاعروں کا دور آگیا۔ اس دور کا سلسلہ کم و بیش آج

---

[1] "کشمیر میں اردو" از عبدالقادر سروری۔ ص ۲۳۔ جلد ۳
[2] یہاں مراد ہے کشمیر میں۔
[3] غلام احمد مہجور، رامانند ساگر، مہندر رینہ، دینا ناتھ نادم

تک دائم و قائم ہے۔

آزادی سے پہلے یہاں ہمیں صوفیانہ، رومانی اور ترقی پسند شعری روایات و رجحانات اور تحریکات کا غلبہ نظر آتا ہے۔ آزادی کے بعد ان کی جگہ صرف ترقی پسند تحریک نے لی اور پھر کئی سالوں کے بعد جدیدیت کا رجحان کشمیر کی اردو شاعری پر حاوی ہو گیا۔

آیئے اب ذرا سنہ ۱۹۴۷ء سے سنہ ۱۹۶۰ء تک کی کشمیر کی اردو شاعری پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے آگے بڑھیں۔

سنہ ۱۹۴۶ء میں کشمیر ایک سیاسی بیداری کے دہانے پر تھا، آزادی کے ترانے گونج رہے تھے، اقتصادی بدحالی کا خاتمہ ہو رہا تھا، غلامی کی صدیوں پرانی زنجیریں کٹ رہی تھیں، شاعری میں ترقی پسندی کا خون رواں دواں تھا، حقیقت پسندی کا ہر طرف شور تھا۔ صوفیانہ شاعری اور رومانی شاعری کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ مقصدی شاعری کا بول بالا تھا۔ کشمیر سے باہر کرشن چندر، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، ملک راج آنند، سجاد ظہیر اور راجندر سنگھ بیدی وغیرہ "ادب برائے زندگی" کے گن گا رہے تھے۔

یہاں[1] پریم ناتھ پردیسی، رامانند ساگر، ماہ، جہجور وغیرہ کلچرل کانگریس کو "مقصدی لائنوں" پر چلا رہے تھے، نادم، راہی، فراق اور ان کے دیگر ہمعصر اس کارواں میں بڑے کرّ و فر سے ان کے ہمسفر تھے۔ ترقی پسندوں کے اس کارواں نے شاعری کو زلف و خال، لب و رخسار، حسن و عشق، رندی و درویشی سے نکالا اور اس کو انسان کی اقتصادی اور معاشی صورت حال سے جوڑ دیا۔ گویا شاعری میں سیاست کا چلن ہوا۔ سیاست کے آجانے سے نعرہ بازی کا زمانہ آیا۔ نعرہ بازی نے جذباتیت کو جنم دیا، شعری نزاکتوں اور موشگافیوں کو بالائے طاق رکھ دیا گیا اور مقصدیت کے نام پر ہر نعرہ روا رکھا گیا۔ اس طرح فنی غلطیاں

---

[1] ۔ یہاں مراد کشمیر ہیں۔

سیاست اور جذبات میں گم ہوگئیں۔ بقول محمد یوسف ٹینگ :-

"اشتراکی رجحان کا اثر گہرا اور ترقی پسند تحریک کی گرفت بیحد سخت تھی، بلکہ ایک باقاعدہ تنظیم کلچرل کانگرس کے نام سے قائم تھی۔ جہاں فنی موشگافیوں کو سلجھانے کی بجائے، سیاسی صف بندی (REGIMENTATION) کی ہدایات جاری تھیں[۱]۔"

یہاں یہ بات صاف ہوتی کہ ۱۹۴۷ء میں پرانی شعری تحریکات ختم ہوئیں اور مقصدی شاعری کا چلن ہوا۔ گویا شاعری حضرت انسان اور اس کے ارد گرد چلنے لگی۔ مگر ترقی پسندی کا سب سے بڑا نقصان جو ہوا وہ یہ کہ شاعر، شاعر سے زیادہ سیاست داں لگنے لگا، اس کی بات جذباتیت سے پُر اور نعرہ بازی کے مترادف لگنے لگی، وہ طبقات میں کھو گیا، فن اور فکر میں ہیجان انگیزی آئی۔ سرمایہ دار اور مزدور کی باتیں کرتے کرتے شاعر ایک عوامی جلسوں کا لاؤڈ اسپیکر (LOUD SPEAKAR) بن گیا۔

لیکن اس دور نے (ترقی پسند) ہیئت اور فارم پر جتنے تجربے کئے کسی اور دور میں نہیں کئے گئے۔ یہ اس تحریک کا ہی حاصل ہے کہ شاعری میں نظم معریٰ، نظمِ مُرجز، آزاد نظم، سانیٹ، مسدّس، رباعی، قطعے اور کلاسیکی و غیر کلاسیکی اصناف میں منظومات کے انبار لگ گئے۔ شاعری میں ترنّم کی جگہ جذبۂ دردں، تصوّف کی جگہ رجزیہ انداز، شاداب اور امیجزی انداز آ گیا۔ اگرچہ یہ تجربے نئے تھے، لیکن تھے نہایت دلفریب، بندھی ٹکی تشبیہات، فرسودہ استعارات، رمز و کنایات کو یکسر ختم کیا گیا۔ ان کی جگہ زندگی کے روزمرّہ جزئیات سے کام لیا گیا۔

ترقی پسند تحریک سے سب سے بڑا فائدہ جو کشمیر کی اردو شاعری کو

---

[۱] - "کشمیر میں اردو" کے پیش لفظ میں یہ سطور ٹینگ صاحب نے رقم کی ہیں۔

پہنچا، وہ ہے پیکر تراشی اور نرم گرم زندگی سے بھرپور پیار- انگریزی کی معنی خیزیت اور ہندی کے رس کو اس طرح اردو شاعری میں لایا گیا کہ اردو زبان کی شاعری کی بالغ نظری، وسعت اور علمی بصیرت و بصارت میں مزید اضافہ ہوا-

اس طرح (VOCABULARY) اور مرقعوں کا بھی ایک بلیغ انبار لگ گیا-

ترقی پسندی کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ اس نے شاعری کو محض سماج کی چیز سے نکال کر اس کو زندگی سے قریب کردیا- شاعری الہام سے زیادہ "سوچ" بن گئی اور اس میں زندگی کی جیتی جاگتی روح نظر آنے لگی-

تیسری سب سے اہم خوبی، جو ترقی پسند تحریک سے اردو شاعری میں آئی، وہ یہ تھی کہ شعروادب میں ذخیرۂ الفاظ وافر مقدار کے ساتھ مردانہ آہنگ، جنگجویانہ جلال اور خطیبانہ رجز کے نئے سُر گونجنے لگے-

۴۷ء سے ۵۸ء تک جو اصنافِ سخن روایتی دور کے بعد زیادہ مقبول ہوئیں، اُن میں نظم، نظمِ جدید اور نظمِ معریٰ قابلِ ذکر ہیں- روایتی دور میں غزل اور مثنوی کی دُنیائے شاعری پر حکمرانی تھی، ترقی پسند دور میں ان کی جگہ آزاد نظموں اور نظمِ رجز نے لے لی- گویا ساری اردو شاعری کے کینوس نہ صرف بڑی حد تک تبدیل ہوئے، بلکہ انھیں نئے رنگ اور نئے ڈھنگ سے سجایا گیا- ابہام اور ایہام کی نت نئی صورتیں سامنے آنے لگیں، انگریزی اور ہندی کے اثرات بھی بڑھ گئے- BALLAD جیسی نظموں کا چلن عام ہوا-

غزل میں حیرت ناک تبدیلی آئی- زلف وخال، لب ورخسار، حسن وعشق، پیار و محبت، ہجر و وصال، افسردگی اور یاس، جلوت وخلوت سے زیادہ اب زندگی کی تلخ کامی، غمِ روزگار کی ستم رانی اور غمِ دوران کا بیان ہونے لگا- چھوٹی غزلوں کے ساتھ ساتھ، غزلِ مسلسل کا رواج بھی ہوا- مسدس کا زور بھی بڑھا- غرض اردو زبان وادب میں ایک دلفریب انقلاب آیا، جس نے نہ

صرف پُرانے اسالیب کو نئی جہتیں عطا کیں، بلکہ اس میں خاطر خواہ اضافہ بھی کیا
سنہ ۱۹۴۰ء کے آس پاس جدیدیت ایک طاقت ور رجحان کے طور پر اُبھر کر
سامنے آئی۔ اس نے شاعری کے انگ انگ کو جھنجھوڑا، اعصابی تناؤ کو ڈھیلا
کیا، آدرش وادیت کا نقاب اُلٹ کر رکھ دیا۔ بیرونی واردات سے زیادہ،
اندرونی یا داخلی واردات کا نظارہ کرایا۔ روس میں جب DESTALIZATION ہوا تو
آدرش وادیوں اور اشتراکیوں کو ایک ذہنی جھٹکا لگا۔ اُن کی سوچ پر ایک برقِ
ناگہانی گری، ان کا ذہن اس اچانک حملے سے کئی سالوں تک ماؤف رہا۔ وہ
اپنی ذہنی دنیا اُجاڑ دیئے جانے کے لئے آمادہ نہ تھے۔ راہی اور نادم جیسے
کہنہ مشق اور اہم شاعر کئی سالوں تک اس "واردات" کی بناء پر خاموش رہے۔

باب پنجم

جموّں و کشمیر میں
اُردو زبان و ادب کی صورتِ حال

جمّوں و کشمیر میں
اُردو زبان و ادب کی صورتِ حال

اُردو کشمیر میں فارسی کے بعد آئی اور فارسی سے پہلے یہاں سنسکرت کا راج تھا۔
ہر زبان نے اپنے اثرات چھوڑے اور ہر اثر نیا جامہ پہن کر چمکنے اور دمکنے
لگا۔ تاثر اور تخلیق میں چونکہ چولی دامن کا واسطہ ہوتا ہے اس لئے زبان و ادب
بھی کے سہارے چلتے ہیں۔ تاثر کچھ کرنے کے لئے اکساتا ہے اور تخلیق جنم لیتی
ہے۔ کشمیر میں سنسکرت کا تاثر فارسی پر رہا اور فارسی نے اُردو پر اپنے تاثر کو
برقرار رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر میں فارسی تخلیقات پر سنسکرت کا خاطر خواہ اثر
نظر آتا ہے۔ شہمیری خاندان (۱۵۸۶-۱۳۳۹ء) رخصت ہوا تو فارسی بھی دم
توڑنے لگی۔ اردو نے کسی حد تک غیر محسوس انداز میں وادی میں قدم رکھے۔
باہر اردو کی دھوم تھی مگر یہاں ابھی فارسی کا ہی راج تھا۔

ڈوگرہ راج کے رنبیر سنگھ کا عہد (۱۸۸۵-۱۸۵۶ء) اردو کے لئے ایک خوش
آئند دور رہا۔ اِسی زمانے میں اردو واحد تدریسی زبان بن گئی۔ اسکولوں
میں اس ذریعۂ تعلیم کا درجہ بھی پایا۔ ایک طرف اُسے سرکاری سرپرستی
حاصل ہوئی، دوسری طرف عوام نے بھی اس کو گلے لگایا۔ گویا جمود زدہ قوم
کو اپنے اظہار کا ایک بہترین ذریعہ ہاتھ آگیا۔ یہاں کے پڑھے لکھے لوگوں نے

اسی زبان میں اپنے مافی الضمیر کو پیش کرنے کی سعی کی۔ یہاں اس زبان کا مطالعہ کافی بڑھا۔ اس کے نتیجے میں مباحثے، ڈرامے اور دوسری ادبی سرگرمیاں عام ہوگئیں۔ یہاں کی ہر انجمن، ہر ثقافتی مجلس اور ہر ادبی مجلس نے اُردو کا سہارا لیا اور یہ سلسلہ ابھی تک قائم و دائم ہے۔ ان انجمنوں میں قابلِ ذکر یہ انجمنیں رہیں: (۱) حلقۂ اربابِ ذوق، (۲) انجمن ترقی پسند مصنفین (۳) بزمِ خنداں۔ اِن انجمنوں نے اردو کے مطالعے کے لئے مختلف سنیٹر قائم کئے، اور ساتھ ہی ساتھ تخلیق و تنقید کے نئے شعبے بھی قائم کئے۔ مشاعروں کا انعقاد کیا گیا، نت نئی شعری جہتیں وجود میں آئیں۔ "شامِ افسانہ" منعقد کی گئی اور نئے نئے تخلیقی رویوں کو افسانے کی دنیا میں داخل کیا گیا۔ جن شاعروں اور ادیبوں نے آزادی سے پہلے کشمیر میں اُردو زبان و ادب میں تخلیقی وسعت پیدا کی، اُن میں پریم ناتھ پردیسی، دینا ناتھ نادم، غلام رسول نازکی، نندلال طالب، پریم ناتھ درد، شہ زور کشمیری، عبدالحق برق، غ۔م طاؤس، قیصر قلندر اور کومل نین پرواز وغیرہ چند قابلِ ذکر نام ہیں۔ یہ سارے ادیب اور شاعر "حلقۂ اربابِ ذوق" اور "ترقی پسند مصنفین" تنظیموں سے کسی نہ کسی طور وابستہ رہے۔

شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ ساتھ اردو صحافیوں نے بھی اُردو زبان و ادب کے فروغ کے لئے بھرپور حصہ ادا کیا۔ انھوں نے ۱۸۸۶ء (پہلے اردو اخبار "بدیا بلاس" کا سنِ اجراء) سے لے کر تا ایندم اپنے اخبارات سے اُردو زبان کو عوامی بنانے میں کافی نمایاں کام کیا۔

"بدیا بلاس"، "ہوئیا"[1] "رہنبر"[2] "چاند"، "ہویا" "پربھات"[3]۔ اِن سب اخبارات نے اپنے مخصوص کالموں میں ادبی سرگرمیوں اور روداد کا ذکر بڑی شد و مد سے کیا اور اردو ادب کی تخلیقی وسعت میں ایک جاندار اضافہ کیا۔ سرینگر کے اخبارات "مارتنڈ"، "وِتستا"، "ہمدرد"، "آفتاب" اور "آئینہ" نے بھی اردو زبان و ادب

---

[1] وادی کا پہلا اردو اخبار [2] آزاد صحافت کا پہلا نمونہ [3] پونچھ کا اخبار

کو عام اور مقبول بنانے کے لئے ہر ممکن قدم اُٹھائے۔ وادی میں اردو شاعری کے ارتقا میں مشاعروں کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ ان مشاعروں میں غیر منقسم ہندوستان سے اس عہد کے اہم شعراء شرکت کرنے آتے تھے۔ ان مشاعروں ذکر سرورؔی صاحب نے اپنی کتاب "کشمیر میں اردو" میں کیا ہے۔ ان مشاعروں میں مولانا شبلی، جگر مراد آبادی، فیض احمد فیض، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، ساغر نظامی، جگن ناتھ آزاد، وامق جونپوری، کمال احمد صدیقی اور سلام مچھلی شہری وغیرہ آتے تھے۔ وادی میں اُس وقت جو شعراء لیلائے اردو کو سنوار رہے تھے، اُن میں نند لال طالب، شہزور کشمیری، غلام رسول نازکی اور شوریدہ کشمیری خاص طور پر یاد کئے جا سکتے ہیں۔ ان شاعروں نے ادبی رجحانات، دبستانوں اور اسکولوں سے شعری روایات لیں اور ان میں نئے نئے تجربات کئے۔" ان کے تجربوں سے ہمیں عصری آگہی اور شعر و ادب میں تنقیدی بصارت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔"[1]

کشمیر میں غلام رسول نازکی نے "دیدۂ تر" اور نند لال کول طالب نے "رشحاتِ تخیل" لکھ کر اردو شعر و ادب میں نمایاں اضافہ کیا۔ ڈاکٹر حامدی کاشمیری کے افسانوی مجموعے "وادی کے پھول"، "برف میں آگ"، "سراب" اور "بہاروں میں شعلے"، "پگھلتے خواب" "بلندیوں کے خواب" (ناول) اور "پرچھائیوں کا شہر" (ناولٹ)، نور شاہ کے افسانوں کا مجموعہ "بے گھاٹ کی ناؤ" "من کا آنگن" وغیرہ سے افسانوی ادب اور نئی شعری تکنیک میں قابلِ قدر اضافہ ہوا۔

آیئے! اب ذرا یہاں کے تخلیق کردہ تنقیدی ادب پر بھی نظر ڈالتے ہیں۔ اس سلسلے میں جو نام سب سے پہلے ہمارے سامنے آتے ہیں، وہ ہیں۔ ڈاکٹر حامدی کاشمیری، ڈاکٹر اکبر حیدری، محمد یوسف ٹینگ، ڈاکٹر ظہور الدین، ڈاکٹر برج پریمی اور پروفیسر نند لال طالب۔ ان حضرات نے نہ صرف تحقیق و تنقید میں نمایاں کام کیا، بلکہ ان کا کام اُردو زبان و ادب کے لئے ایک بیش بہا خزانہ

---

[1] جموں و کشمیر اُردو ادب نمبر۔ از منظر اعظمی۔

بن گیا۔ بقول ڈاکٹر برج پریمی:

"آزادی کے بعد اُردو تحقیق اور تنقید نے کافی منزلیں طے کیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد دراصل سائنسی عہد کا آغاز ہوتا ہے۔ ادب کا تجزیہ بھی نفسیات، معاشیات اور سماجیات کی طرح سائنس کی روشنی میں کیا جانے لگا۔ اس نئے ذہنی رویّہ نے تنقید و تحقیق کے زاویے بدل دیئے۔"[1]

تحقیق کے کارنامے، جدید نفسیات اور سماجی علوم کی مدد سے انجام پانے لگے۔ مغربی علم و فن کے مطالعے نے تحقیق اور اقتصادی شعور کو جِلا بخشی، طرزِ بیان اور اسالیب کی شگفتگی نے ادبی تحقیق اور تنقید کو ریاضی کے فارمولائی انداز سے نکال کر سلاست اور شستگی عطا کی۔ انفرادی اور آزاد کارناموں کے ساتھ ساتھ یونیورسٹیوں اور اکاڈمیوں کے توسط سے بھی اردو تحقیق و تنقید کو سہارا ملا۔

آزادی کے بعد جو محقّق اور ناقد اُبھرے، اُن میں ڈاکٹر حامدی کاشمیری کا نام سرِفہرست ہے۔ اُن کی شخصیت ہمہ جہت ہے۔ انھوں نے شاعری، افسانے، ناول اور تحقیق و تنقید وغیرہ اصناف پر اپنا قلم آزمایا۔ لیکن اِدھر چند برسوں سے انھوں نے تحقیق اور تنقید کو ہی اپنا خاص موضوع بنا لیا ہے۔ "جدید اُردو نظم اور یوروپی اثرات"۔ "غالب کے تخلیقی سرچشمے"۔ "نئی حسیّت اور عصری اردو شاعری"۔ "کارگہہ شیشہ گری"۔ "غالب اور اقبال"۔ "ناصر کاظمی کی شاعری" وغیرہ اس شعبے میں ان کے اہم کارنامے ہیں۔

محققین میں ڈاکٹر اکبر حیدری وہ اعلیٰ شخصیت ہے، جنھوں نے اردو کی کلاسیکی شاعری پر بے تکان قلم چلایا ہے، انھوں نے اپنی محققانہ جگرکاوی سے بے شمار نادر و نایاب تصنیفات کی دریافت کی ہے۔

---

[1] "جموں و کشمیر میں اردو تحقیق و تنقید"۔ از ڈاکٹر برج پریمی (بحوالہ جموں و کشمیر اردو ادب نمبر)

حیدری صاحب نے بہت کچھ لکھا ہے۔ چنانچہ ان کی لکھی ہوئی کتابوں کی تعداد پچاس تک پہنچتی ہے۔ اِن کے علاوہ اِن کے مضامین (جو مختلف موضوعات پر ہوتے ہیں) ہند و پاک کے مؤقر اخبارات و رسائل اور جرائد میں شائع ہوتے ہیں۔ کلاسیکی شعراء، مراثی، قصائد، مثنویوں اور تذکروں پر اُن کا کام اُردو تحقیق و تنقید میں ایک منفرد اور اعلیٰ کام مانا جاتا ہے۔ میرؔ۔ انیسؔ، دبیرؔ، شادؔ، میر حسنؔ اور مصحفیؔ پر اُن کا کام ایک سنگِ میل کی سی حیثیت رکھتا ہے۔

(ڈاکٹر عزیز قریشی کا نام بھی اردو تحقیق و تنقید میں بڑے ادب سے لیا جاتا ہے۔ عزیز صاحب کا اگرچہ بُنیادی موضوع دینیات رہا ہے۔ پھر بھی ان کی تنقید میں جدید حسیت اور انگریزی زبان و ادب کی گہری واقفیت کا پتہ ملتا ہے) "جدید تنقیدی زاویے" اور "ہماری قومی اور انقلابی شاعری" ان کی ایسی کتابیں ہیں، جن سے شعر و ادب کے رموز سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ وہ ایک خاص ترتیب و تنظیم کے ساتھ اپنے خیالات کو پیش کرتے ہیں۔ جن سے اُن کی بالغ نظری اور وسعتِ علم کا بیّن ثبوت ملتا ہے۔

محمد زماں آزردہ کو بھی تحقیقی زُمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ دبیرؔ پر اُن کا کام ایک غیر جانبدار مطالعہ لگتا ہے۔ اُن کا یہ تحقیقی مقالہ دبیرؔ کا ادبی مقام متعیّن کرنے کی ایک مستحسن کوشش ہے۔ ہند و پاک کے جرائد میں اُن کے بصیرت افروز تحقیقی مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں، جن میں اُن کی بصیرت اور بصارت دونوں کا پتہ چلتا ہے۔

ڈاکٹر برج پریمی کشمیر کے محققین میں ایک معتبر اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ وہ اُردو فکشن پر گہری نظر رکھتے ہیں اور فکشن کے تمام اسرار و رموز سے نہ صرف واقف ہیں، بلکہ اس میں نئی جہتیں بھی پیدا کرتے ہیں۔ "حرفِ جستجو" اُن کے گہرے مطالعے اور نہایت کٹھن محنت کا نتیجہ ہے۔ اس سے ان کے ذہنی رویّے کی نشان دہی ہوتی ہے اور بے لاگ تنقیدی بصیرت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اِن کے

مضامین تلاش و جستجو کی نہایت اعلیٰ کیفیتیں ہیں ۔ اُن میں بعض فن کاروں کے تخلیقی عمل اور اُن کے کام کے بعض اہم پہلوؤں پر تجزیاتی مطالعہ نظر آتا ہے ۔ اُن کے مضامین مُلک کے مقتدر جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں ۔ وہ نہایت چابکدستی ، خلوص اور ادبی دیانتداری کے ساتھ تحقیقی اور تجزیاتی مطالعے کو پیش کرتے ہیں ۔ سعادت حسن منٹو پر ان کا تحقیقی اور تنقیدی مقالہ ، منٹو کی حیات اور ان کے کارناموں کے تجزیاتی مطالعے پر اُردو میں اہم کتاب ہے ۔ برج پریمی کی خاص بات یہ ہے کہ وہ نہ تو روایات کے حصار میں بند رہتے ہیں اور نہ ہر صحیح یا غلط جدید ادبی رجحان یا رویّہ کو آسانی کے ساتھ قبول کرتے ہیں ۔ ادب و تہذیبی اقدار کے ردو قبول میں وہ خود اپنے تخلیقی شعور اور تنقیدی بصیرت پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں ۔

محمد یوسف ٹینگ کشمیر کے ایک ایسے بالغ نظر نقاد ہیں ، جو نہ صرف اردو ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں ، بلکہ کشمیری ادب پر بھی ان کی نگاہ بہت دور تک دیکھتی ہے ۔ غالبؔ ، اقبالؔ ، منٹوؔ اور کشمیری ادبار و شعرار پر اُن کے عالمانہ اور تحقیقی مقالے چھپ چکے ہیں ۔ مختلف کتابوں پر اُن کے مقدمے "مولوی عبدالحق" کو زندہ کرتے ہیں ۔ ان کا مطالعہ نہایت وسیع اور بصیرت افروز ہے ۔ شگفتہ اُسلوب اور منطقی استدلال سے ایک نئی سوچ و فکر کا احساس ہوتا ہے کشمیری ، ڈوگری ، لداخی اور اُردو پر اُن کی وسعتِ نظری عموماً دیکھنے کو ملتی ہے ، وہ کشمیر کی تاریخ ، لسانیاتی آہنگ اور تہذیبی و ثقافتی عروج و زوال کو پہچانتے ہیں اور اُن کے تانے بانے سے ہر سمت گہری واقفیت رکھتے ہیں ۔ وہ بیک وقت تاریخ داں ، محقق ، نقّاد اور صحافی ہیں ۔ ادب کلاسیکی ہو یا نفسیاتی ، سائنسی ہو یا سماجیاتی ، جدید ہو یا قدیم ، وہ ہر ایک کی تاریخ اور ادوار سے گزرتے ہیں ۔ اور اپنی فکر سے استدلالہ تحقیقی شعور کے خزانے منظرِ عام پر لاتے ہیں ۔ دفینوں کو کھنگھال کر دریافت کرنا اُن کی عادت ہے ۔

کشمیر کے دوسرے اہم نقادوں میں مرغوب بانہالی، رشید نازکی اور موتی لال ساقی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ یہ سب اُردو کے بڑے ایوانوں میں رسائی حاصل کر چکے ہیں۔ شعبۂ اُردو کشمیر یونیورسٹی کے اقبال انسٹی ٹیوٹ اور کلچرل اکادمی نے اردو شعروادب میں بیش بہا اضافے کئے ہیں۔ ان اداروں نے نہ صرف تحقیق و تنقید کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، بلکہ شاعری کو بھی صحت مند موڑ دیئے ہیں۔ شعبۂ اردو کے رسائل "بازیافت" "آگہی" اور "شعور"۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کے مجلوں اور ریاستی کلچرل اکادمی کے مجلّے "شیرازہ" اور "ہمارا ادب" میں اعلیٰ معیار کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔

کشمیر میں اُردو زبان وادب کے فروغ اور اردو تنقید و تحقیق کے ارتقاء کے باب میں پروفیسر شکیل الرحمٰن نے غیر معمولی کارنامے انجام دیئے ہیں۔ ہر چند کہ پروفیسر شکیل الرحمٰن کشمیری الاصل نہیں، لیکن وادئ کشمیر کو انھوں نے اپنا وطن بنالیا ہے اور کم و بیش گزشتہ تیس برسوں سے وہ اسی وادئ گل میں رہ کر اُردو تحقیق و تنقید کے سرمائے میں گرانقدر اضافہ کر رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت کشمیر میں جتنے بھی نئے محقق اور نقاد ہیں، ان میں سے اکثر و بیشتر کی تربیت ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے ہی کی ہے۔ آپ نے ایک بالغ نظر استاد کی حیثیت سے نت نئے اہم موضوعات پر تحقیقی و تنقیدی مقالے تو لکھوائے ہی ہیں۔ اگر غائر نظر سے دیکھا جائے تو شکیل صاحب ہمیں ایسے ناقد نظر آئیں گے جو نہ صرف جمالیات کی روشنی میں فن اور فنکار کا تجزیہ کرتے ہوئے دکھائی دیں گے، بلکہ وہ نفسیات اور اساطیر کو بھی بنیادی اہمیت دیتے ہوئے سامنے آئیں گے۔ وہ تخلیق اور تخلیق کار کے باطن میں جھانکتے ہیں اور پھر دیانتدارانہ خلوص کے ساتھ اپنی آرار کا اظہار کرتے ہیں۔ شکیل صاحب مغربی ادب پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ اور مغربی ادب کے تمام رموز و اسرار سے واقف ہیں۔ وہ یونگ، اڈلر اور

ارک فروم کی ذہنی کشاکش سے بھی لطف اُٹھاتے ہیں اور ہندوستانی جمالیات سے بھی من بہلاتے ہیں۔ جمالیات سے فیض حاصل کرنا اُن کا محبوب مشغلہ ہے۔ اُن کی تنقیدی بصیرت سے ہزاروں ادیب فائدہ اُٹھا چکے ہیں اور آج بھی وہ اُردو کی خدمت گزاری میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عصرِ حاضر کے نقادوں میں ایک منفرد اور اعلیٰ مقام پا چکے ہیں۔ غالب کی جمالیات، اقبال کا فلسفہ اور شکیل کی نزاکت و فیض کی کلاسیکیت پر انھوں نے سیر حاصل بحثیں کی ہیں اور اپنی شعر فہمی کا سکہ بٹھایا ہے، ان کی کتابوں کی ندرت، فکر و نظر کی وسعت، اعلیٰ تنقیدی بصیرت اور اُسلوب کی انفرادیت، اتنی اہم اور جاندار ہے کہ آنے والا زمانہ انھیں کبھی بھی "کل کی چیز" سمجھ کر نظر انداز نہیں کر سکے گا۔

کشمیر کے مہمان ادیبوں میں پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم کی خدمات روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں۔ وہ تحقیق کے شاہسوار اور تنقید کے سپہ سالار تھے۔ انھیں تحقیق سے جنون کی حد تک عشق تھا۔ کشمیر میں اگرچہ انھوں نے صرف دس سال تک قیام کیا، مگر اس قلیل عرصے میں انھوں نے کشمیر کے تعلق سے گرانقدر کتابیں تصنیف کیں۔ "کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ"، "دو بھائی، دو ادیب"[1]، "تاریخ ادبیات کشمیر"[2] اور "کشمیر میں اُردو" کے عنوان سے معرکے کی کتابیں لکھ کر کشمیر کے تعلق سے ایک دستاویزی اہمیت کی حامل ادبی خدمات سرانجام دیں۔ یہ ساری کتابیں نہ صرف ضخیم ادبی سرمایہ ہیں، بلکہ تحقیق و تنقید کے پوشیدہ دفینوں کی بازیافت بھی ہیں۔ ہر کتاب اپنے موضوع اور کینواس کے لحاظ سے ندرت رکھتی ہے اور کشمیر کے چپّے چپّے کی ادبی تاریخ کا پتہ دیتی ہے۔

پروفیسر آلِ احمد سرور کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ اُردو ادب میں

---

[1] ڈوگرہ راج کے دو ادیبوں اور شاعروں کے حالاتِ زندگی۔
[2] یہ تین جلدوں پر مشتمل ہے۔

ایک مینارۂ نور ہیں، جن سے ہر ایک نیا ادیب و شاعر فیض حاصل کرتا ہے۔ اُنھوں نے اپنی ہمہ جہت نگرانی میں یہاں اقبال انسٹی ٹیوٹ قائم کیا اور اقبالیات کے غور و فکر کو عام کیا۔ ان کی تنقیدی بصیرت سے کشمیر کا ہر ادیب اور شاعر فیض یاب ہوا ہے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد بھی کشمیر کے جہان ادیبوں اور شاعروں کے ہر اول دستے میں نظر آتے ہیں۔ وہ کشمیر میں اپنی زندگی کا بہترین حصّہ گزار چکے ہیں۔ اُنھیں کشمیر کے حسن و جمال سے والہانہ محبّت ہے۔ وہ کشمیر کو اپنے محبوب اقبال کی نظر سے دیکھتے ہیں، اُنھوں نے اپنی سوچ، اپنی شاعری اور اپنے خیالات سے کشمیر اور کشمیر کے لوگوں سے بے انتہا پیار کیا ہے۔ وہ کشمیر کے سچے عاشق اور "اقبال کے وطن" کے شیدائی ہیں۔ ریاست میں اپنے قیام کے دوران، اُنھوں نے "اقبال اور کشمیر"، "اقبال اور مغربی مفکرین" اور "نشانِ منزل جیسی کتابیں لکھیں۔

آزاد صاحب، اقبال کے ایک عاشقِ صادق اور کشمیر میں اُردو ادب کے ایک پُر خلوص معمار ہیں۔ وہ اُردو کے ایک جلیل القدر شاعر تو ہیں ہی مگر تحقیق اور تنقید کے میدان کے شہسوار بھی ہیں۔ وہ "اقبال" کے کئی ایسے پہلوؤں کو بھی منظرِ عام پر لائے ہیں، جو گوشۂ تاریکی میں پڑے ہوئے تھے۔ وہ شعر فہمی اور شعر گوئی دونوں پر قدرت رکھتے ہیں۔ فلسفے کی باریکی اور جمالیاتی روشنی کی پرکھ کے خاص نباض ہیں۔ وہ نہایت خلوص اور ادبی دیانتداری کے ساتھ اپنی آرا کا اظہار کرتے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی بے محل نہ ہوگی اگر میں اُن نقادوں اور محققوں کا ذکر کروں، جو اس وادی گُل پوش میں ہمارے درمیان بہت کم وقت گزار پائے۔ لیکن اُن کے قیمتی مقالات اور تحقیقی سرمائے سے کشمیر کے ادیب اور شاعر نہ صرف متاثر ہوئے ہیں، بلکہ اُن سے فیض بھی حاصل کیا ہے۔ ان

نقادوں اور محققوں میں ڈاکٹر جعفر رضا، ڈاکٹر قدوس جاوید، ڈاکٹر کبیر جالسی، منظر امام اور منظر اعظمی کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

اگرچہ تحقیق اور تنقید میں کشمیر کا حصہ بہت ہی کم رہا ہے۔ مگر معیار کے اعتبار سے بہت ہی اعلیٰ وارفع ہے۔ جس کو ادبیات کا کوئی بھی سنجیدہ قاری نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ہمارے کارنامے موضوع کے تنوع کے اعتبار سے کسی بھی حالت میں کم تر درجہ نہیں رکھتے۔

اس کی وجہ، اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ ہم نے اردو کی دلہن کو ہر طرح اور بے انتہا سجانے کی کوشش کی ہے۔ کیوں کہ ہم اس کے ساتھ صدیوں سے والہانہ محبت کرتے رہے ہیں۔

جموں و کشمیر ہندوستان کی واحد ریاست ہے، جہاں اردو سرکاری زبان ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اردو تمام سرکاری دفاتر میں رائج نہیں اور بعض سیاسی وجوہ کی بنا پر اُردو کو "پورا" سرکاری مقام نہیں دیا جاتا۔ پھر بھی یہ بات باعثِ اطمینان ہے کہ یہاں کے اردو ادیبوں نے، اُردو کو الگ الگ خطوں اور علاقوں کے درمیان پُل بنا دیا ہے۔ آج اردو ہی خیالات و جذبات کے باہمی اظہار کا واحد ذریعہ نظر آئی ہے۔ یہ بات بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اردو نثر کے لئے وادی ذرا بنجر رہی اور اردو شاعری نے یہاں کافی وسعت پائی۔ بقول منظر امام :-

"ریاست میں جہاں تک اردو کا تعلق ہے، نثر کے مقابلے میں شاعری کی طرف رجحان زیادہ ہے۔ یہ رجحان ریاست میں ہی نہیں، ملک کے دوسرے علاقوں میں بھی ہے۔ لیکن یہاں یہ رجحان اس لئے نمایاں ہے کیوں کہ نثر کی طرف توجہ دینے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔"[۱]

---

[۱] - جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نئی نسل کے امکانات۔ از منظر امام (تعمیر کا جموں و کشمیر ادب نمبر)

آیئے۔ اب ذرا اُن کی بات کریں، جنھوں نے آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد دونوں زمانوں میں قدامت کو بھی دیکھا اور جدیدیت سے بھی آنکھیں ملائیں۔ ان شاعروں اور ادیبوں میں ڈاکٹر حامدی کاشمیری سرِ فہرست نظر آتے ہیں۔ حامدی ہی اُن ادیبوں میں وہ واحد ادیب ہیں، جنھوں نے عصری حسیت اور نئے مزاج کو سب سے پہلے قبول کیا۔ اُن کے بعد ہی ہمدم کاشمیری، حکیم منظور، مظفر ایرج وغیرہ کا نام آتا ہے۔

حامدی صاحب نے نہ صرف عصری مزاج اور نئی شاعری میں وسعتیں پیدا کیں، بلکہ اُنھوں نے نت نئے تجربوں سے ایک منفرد جگہ بھی بنالی۔ گذشتہ دو دہائی سے وہ لگاتار لکھ رہے ہیں اور اِن برسوں میں انھوں نے اپنی بصیرت اور بصارت سے ہزاروں چراغوں کو روشن کیا۔ انھوں نے اپنی شعری تخلیقات سے اردو ادب کو جگمگایا اور اپنے تنقیدی مقالات سے اردو تحقیق و تنقید کے نئے باب کھولے ہیں۔

وقت کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے جمود کے بادل چھٹنے لگے، کشمیر کے ادیبوں اور شاعروں نے، جن میں پُرانی نسل کے کچھ ادیبوں کے علاوہ نئی نسل کے بہت سے لکھنے والے بھی شامل تھے۔ اُنھوں نے ریڈیو اور شعبۂ نشر و اشاعت اور کلچرل اکادمیوں کے علاوہ دوسرے ادبی مراکز بھی قائم کرنا شروع کئے۔ یہ صحیح ہے کہ اردو کی ترویج و ترقی میں ریڈیو کشمیر نے بھی ایک مثبت اور فعال کردار ادا کیا۔ یہاں ادیبوں کی "حوصلہ افزائی" کی گئی اور اُنھوں نے ادب کی تخلیق میں نئے نئے تجربے کرنے شروع کئے۔ ریڈیو کشمیر کی مدد سے جو ادیب اور شاعر یہاں آسمانِ اردو ادب پر چمکے۔ ان میں یہ نام قابلِ ذکر ہیں :۔ عبدالرحمٰن راہی، قیصر قلندر، فاروق نازکی، غلام رسول عارف، فاضل کشمیری، دینا ناتھ نادم، مکھن لعل بے کس، محور، ہردے کول بھارتی محمد علی لون، زتشی، اختر محی الدین، ستار احمد شاہد وغیرہ۔

ریڈیو کشمیر کے ساتھ ساتھ کلچرل اکادمی[1] نے بھی مالی معاونت سے یہاں کے ادیبوں اور شاعروں کو اس قابل بنایا کہ وہ صاحبِ کتاب ہو گئے۔ مالی امداد سے بہت سی اچھی اچھی کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔ شعبۂ انفارمیشن نے بھی کئی رسائل[2] نکالے، جن کی وجہ سے اُردو زبان و ادب کی ترقّی و ترویج کی راہ نکل آئی۔

محکمۂ انفارمیشن کے دوش بدوش محکمۂ اطلاعات و تعلّقات عامہ نے بھی سرکار کی پالیسیوں کے فروغ کے لئے ادیبوں اور شاعروں کی خدمات حاصل کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ وادی کے کونے کونے میں ڈرامے اور تفریحی پروگرام منعقد کئے گئے۔ ان کوششوں سے پوری وادی میں اُردو کا ماحول تیار ہوا۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ شاید ہی کوئی حصّہ ایسا ہو، جہاں سے اُردو کی کوئی نہ کوئی ادبی انجمن کام نہ کر رہی ہو۔ اُردو کی صورت کو بہتر بنانے کے لئے کشمیر یونیورسٹی کا شعبۂ اردو قابلِ ذکر اور قابلِ قدر کام انجام دے رہا ہے۔ چنانچہ اس شعبے نے اب تک ایک درجن سے زیادہ پی۔ایچ۔ڈی اسکالرز تحقیقاتی مقالے مکمل کرائے ہیں۔ اور اس وقت بھی بارہ[12] سے زیادہ اسکالر تحقیق کے کام پر لگے ہوئے ہیں۔ یونیورسٹی کے ادبی شعبے سے تقریباً دو رسالے ہر سال اجرا ہوتے ہیں، جو بیرونِ ریاست بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

تدریسی ماحول میں اگرچہ اب بھی اردو کو مخصوص مسائل کا شکار ہونا پڑ رہا ہے، پھر بھی اُردو کی نیّا چلتی ہی نظر آتی ہے۔ آیئے! اب ذرا اُن

---

[1] ۔ یہ اکادمی ۱۹۶۳ء میں وجود میں آئی۔

[2] ۔ "تعمیر"، "شیرازہ" وغیرہ۔

[3] ۔ سابقہ سالوں میں یہ رسائل یہاں سے اجرا ہوئے۔ (۱) نیا شعور" (۲) "عصری آگاہی"

باتوں پر بھی نظر ڈالتے ہیں، جنہوں نے یہاں اُردو کے خدوخال اُبھارے اور اُن کو استحکام بخشا۔

بقول نور شاہ:

"کچھ لوگ اب بھی ترقی پسند ادب کو VULGARITY سے تعبیر کرنے سے نہیں ہچکچاتے ہیں۔ اب اس ادب کو ہنگامی، فروعی اور مصنوعی کہہ کر لتاڑا جاتا ہے۔ لیکن وادیٔ کشمیر میں ترقی پسند ادیبوں کے اُس رول کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا جو انھوں نے یہاں ایک ادبی تحریک کو جنم دینے اور اردو کو ترقی دینے کے سلسلے میں ادا کیا۔ یہ اُن ہی ادیبوں اور شاعروں کا صدقہ ہے کہ آج ملک کے دوسرے حصّوں کے مقابلے میں ہماری ریاست میں اُردو اپنے آپ کو محفوظ پا رہی ہے۔ ہمارے آج کے ادیب اور شاعر جو اس وقت ملک بھر میں شہرت کے مالک ہیں، اِسی ادبی تحریک سے جنم پا چکے ہیں۔ آج جب کہ ترقی پسند تحریک کا زور ٹوٹ چکا ہے، لیکن کشمیر میں اس کے نام لیوا موجود ہیں۔ اور بڑی دلچسپی کے ساتھ اُردو زبان و ادب کی اشاعت و تشہیر کا کام کر رہے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، اِس ادبی کارواں میں نئے لکھنے والے شامل ہوئے اور اس وقت بھی اُردو کے تئیں اُن کی وفاداری اور خلوص پر شک نہیں کیا جا سکتا۔"[۱]

یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۴۷ء کے آخر یا ۱۹۴۸ء کے شروع میں اس تحریک سے اردو کافی فروغ ملا۔ نادم، نور محمد روشن، علی محمد لون، اختر، راہی،

۱۔ "انتخابِ اُردو ادب" از نور شاہ۔ ص ۶

فراق اور سنتوش وغیرہ اسی تحریک کی دین ہیں۔ کلچرل فرنٹ نے ترقی پسند ادب کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ فرنٹ دراصل ترقی پسندی کا ایک نیا جنم تھا۔ اس نے چند سالوں کام کیا اور بڑے بڑے کشمیری ادیبوں کو اُردو کی طرف راغب کیا۔ اس کے بعد کلچرل کانفرنس وجود میں آئی۔ اگرچہ اس کا مقصد یہ تھا کہ علاقائی زبانیں پھلیں پھولیں، مگر اس نے اُردو کے لیے بھی کافی راستہ ہموار کیا۔ ایک طرف کشمیری زبان و ادب ترقی پانے لگا اور دوسری طرف اردو والوں نے بھی نئی تنظیموں اور انجمنوں کا سہارا لیا۔ ان تنظیموں اور انجمنوں کی کوششوں سے کلچرل اکادمی وجود میں آئی۔ جس نے اشاعت و طباعت میں یہاں انقلاب پیدا کیا۔

آزادی کے چند سالوں کے بعد کشمیر کے جو ادیب و شاعر اُردو کے مُلک گیر نقشے پر اُبھرے۔ اُن میں حامدی[1]۔ شمیم احمد شمیمؔ، محمد یوسف ٹینگ "حکیم منظورؔ، برج پریمیؔ، شہیدیؔ اور حیدریؔ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان سب نے اپنی لگن، محنت اور خلوص سے اردو کے پودے کو تناور درخت بنانے کی ہر ممکن کوشش کی اور نہ صرف اُردو کے نئے تقاضوں اور نئے مزاج کو گلے لگایا بلکہ اس میں خاطر خواہ اضافہ بھی کیا۔

سنہ ۱۹۶۰ء کے آس پاس اُردو شعر و ادب میں روایتی ادبی تصورات، موضوعات اور ہیئت و رویّہ کے خلاف احتجاج کے سائے اُبھرنے لگے اور پھر رفتہ رفتہ بعض انگریزی اور فرانسیسی مفکّروں اور ادیبوں کے اثر سے ایک خاص ادبی رجحان معرض وجود میں آیا۔ جسے اُردو میں جدیدیت کا رجحان کہتے ہیں۔ کشمیر کے ادیبوں اور شاعروں نے جدیدیت کے رجحان کو بھی اپنایا۔ خاص طور پر حامدی کاشمیری حکیم منظورؔ، مظفر ایرج وغیرہ کی شاعری اسی دور میں پروان چڑھی۔

---

[1] حامدی کاشمیری

آیئے۔ اب اُن نگارشات پر بھی طائرانہ نگاہ ڈالتے ہیں، جن سے کشمیر میں اردو زبان و ادب کی صورتِ حال تسلی بخش ہوئی اور جنہوں نے اپنے وجود سے باہر کے اردو طبقے میں بھی دادِ تحسین حاصل کی ؛۔

مصنف	تصنیف
(۱) پریم ناتھ پردیسی	"بہتے چراغ" (افسانوی مجموعہ)
(۲) نور شاہ	"من کا آنگن سُونا سُونا"، "ایک رات کی ملکہ"
	"گیلے پتھروں کی مہک"
	"نیلی آنکھیں"
(۳) پریم ناتھ در	"اندھیرے اُجالے"، "دل کے باسی"
(۴) پشکر ناتھ	"عشق کا چاند اندھیرا ہے"
	"شاہد ہے تیری آرزو"
(۵) علی محمد لون	"بلندیوں کا خواب"، "لاحروف"
(۶) حامدی کاشمیری	"سیلاب اور قطرے"
(۷) تیج بہادر	"فطرت" (ناول)
(۸) اکبر حیدری	"ناتمام"، "لہو لمس چنار" (شعری مجموعے)
(۹) حکیم منظور	"نایافت" (شعری مجموعہ)
(۱۰) حامدی کاشمیری	"رشحاتِ تخیل" (شعری مجموعہ)
(۱۱) نند لال طالب	"حرفِ شیریں" (شعری مجموعہ)
(۱۲) قاضی غلام محمد	"دیدۂ تر" (شعری مجموعہ)
(۱۳) غلام رسول نازکی	"ادب اور سماجیات" (تنقیدی مضامین)
(۱۴) ڈاکٹر اے فدوس جاوید	"جلوۂ صد رنگ" (" ")
(۱۵) ڈاکٹر برج پریمی	"دستِ صبا" (" ")
(۱۶) پروفیسر شکیل الرحمٰن	"ناصر کاظمی کی شاعری" (تنقیدی جائزہ)
(۱۷) حامدی کاشمیری	

(۱۸) ڈاکٹر شمس الدین احمد "رسول اللہؐ"

(۱۹) پروفیسر سرور "تنقید کیا ہے؟"

(۲۰) ڈاکٹر برج پریمی "حرفِ جستجو"

(۲۱) رشید تاثیر "تحریکِ حریتِ کشمیر (۳-جلدیں)"

(۲۲) حامدی کاشمیری "کارگہِ شیشہ گری"۔ وغیرہ.....

ان کے علاوہ یہاں کے جن ادیبوں اور شاعروں نے قابلِ ذکر کتابیں لکھی ہیں وہ ہیں۔ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، ڈاکٹر شمس الدین، فاضل کشمیری، قیصر قلندر، اکبر جے پوری، ڈاکٹر برج پریمی، کلدیپ رعنا، شبنم قیوم، رشید تاثیر ڈاکٹر صوفی غلام محی الدین، ڈاکٹر قدوس جاوید، ڈاکٹر محمد زماں آزردہ، شمس الدین شمیم، وحشی، سید ساحل اور عمر مجید۔

ان ساری باتوں اور کام کو دیکھ کر اس بات کا اطمینان ہو جاتا ہے کہ کشمیر میں اُردو شعر و ادب کی صورتِ حال اگرچہ زیادہ اچھی نہیں ہے، لیکن حوصلہ شکن بھی نہیں۔ بقول اقبالؔ ع

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

باب ششم

کشمیر کے نمائندہ شعراء

نے اسی "زمانے" میں تخلیقِ فن کا آغاز کیا، اور کاروانِ ادب میں شامل ہوئے جس کا رہنما ترقی پسندی انھیں آواز دیتی رہی اور وہ اس "کاروان" میں محوِ سفر رہے۔ کبھی اس کاروان کے ایک فعال رُکن بن گئے اور کبھی CHANGE کے لئے اس سے الگ بھی ہوئے۔

نندلال طالب سرینگر کے ایک رئیس خاندان میں ۲۵ دسمبر ۱۸۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام پنڈت ٹھاکر پرشاد تھا۔ وہ وادی کے جید سنسکرت عالم تھے، خوشنویسی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ علم وفن کے اسی ماحول میں طالب پروان چڑھے اور جو چیز انہیں وراثت میں ملی، اس کو انھوں نے اپنی کاوشوں سے عظیم شعری عمارت میں کھڑا کیا۔ تواریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے جدِ امجد پنڈت رگھوناتھ کول کشمیر کے وزیرِ اعظم رہ چکے تھے۔ اُن کے دادا دیوہ کاک کول بھی اپنے وقت کے مانے ہوئے عالم، خوشنویس اور مصور تھے۔ موسیقی سے بھی انہیں دلچسپی تھی علم وفن، موسیقی اور مصوری کے اس ملے جلے ماحول میں طالب کے اندر کا شاعر تجربہ تجسس پاتا رہا اور عمر بھی اسی علمی وفنی سمندر میں غوطے لگاتے رہے اور گوہر مراد حاصل کرتے گئے۔

درندر پرشاد سکینہ بدایونی نے اِن کے حالاتِ زندگی اور شاعری پر ایک مضمون لکھا ہے ("ہماری زبان" دہلی[۱]) اس مضمون کا حوالہ پروفیسر سروری نے اپنی کتاب "کشمیر میں اردو" میں دیا ہے۔ ذیل میں ہم اس مضمون کا ایک اقتباس دیتے ہیں:۔

"طالب نے پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں ایم۔اے کیا اور اُردو کے امتحانات بھی کامیاب کئے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ سری پرتاپ کالج میں اُردو اور فارسی کے لیکچرار مقرر ہوئے، پھر ترقی کرتے کرتے پروفیسر

---

[۱] سروری صاحب نے یہ تو لکھا ہے کہ مذکورہ مضمون "ہماری زبان" میں شائع ہوا تھا لیکن ان کے یہاں تاریخِ اشاعت درج نہیں ہے۔

کے عہدہ پر مامور ہوئے اور کالج کی تعلیم کے ذریعے اپنے طویل تعلق کے باعث سینکڑوں نوجوانوں کے ذوق کی آبیاری کرتے رہے۔ خدمت سے وظیفہ پر سبکدوش ہونے کے بعد بھی ان کے ادبی مشاغل جاری رہے۔ چنانچہ وہ کئی ادبی اداروں کے رکن رہے اور اس وقت کلچرل اکادمی کی جانب سے زیرِ ترتیب کشمیری لغت کے لئے اُن کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔"

کشمیر کے عام شاعروں کی طرح طالب نے بھی اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا۔ شروع میں انھوں نے روایتی غزلیں لکھیں۔ ان میں روایت پسندی، زُلف وخال، لب ورخسار، حسن وعشق، جُدائی ووصال، امید وبیم اور یاس وغم صاف طور پر جھلکتے ہیں۔ طالب نے بہت سے اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی، ان غزل اور نظم قابلِ ذکر ہیں۔ غزل سے زیادہ اُن کے خیالات کی پختگی نظم میں نظر آتی ہے، جس دور میں انھوں نے آنکھ کھولی، اس وقت غزل "بکاؤ" چیز نہ تھی۔ نظم کی ادبی دنیا میں دھوم تھی۔ اس لئے انہوں نے وقت کے تقاضے کو سمجھ کر نظمیں ہی لکھیں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ اُن کی نظمیں، غزلوں سے گرانقدر اور فنی اعتبار سے بہت اچھی ہیں۔

آیئے۔ اب ہم ذرا ایک طائرانہ نگاہ اُن کی نظموں پر ڈالیں اور پھر اُنکی ابتدائی غزلوں کو بھی دیکھیں۔ یہاں پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ طالب نے .WORDS WORTH کی طرح اپنی نظموں میں منظر کشی اور فطرت کی مصوری اتنی مشاقی سے کی ہے کہ نیچرل شاعری اور فطری شاعری کی ان کے یہاں رعنائیاں ہی رعنائیاں نظر آتی ہیں۔ اپنی نظم "بہارِ کشمیر" میں "شالامار" اور "ہاروِن" کی دلکشی یوں بیان ہوتی ہے ؎

نظم میں عینیت کا شائبہ :-

شکستِ آرزو تھی لطفِ بہار دیکھوں کاشانۂ چمن کے نقش ونگار دیکھوں

باغِ نشاط میں ہو، دل کو نشاط حاصل | تازہ نسیم ڈل ہو اور شالامار دیکھوں
کھل جائے مجھ پہ آخر رازِ و نیازِ اُلفت | بُلبل کے سامنے جب گُل کا سنگھار دیکھوں

منظر سرائی :-

چھائی ہوئی گھٹائیں گھنگھور آسماں پر
برسا رہی تھیں موتی ابرِ بہار ہو کر
سروِ سہی کی شاخیں تھیں جھومتی ہوا سے
یا کوئی لڑکھڑاتا تھا بادہ خوار ہو کر

مناظر کا کیف درون بینی کی طرف مائل :-

جلوت میں نورِ کثرت، کثرت میں عین وحدت
آنکھوں میں آسمائے، اغیار، یار ہو کر
نقشِ دوئی مٹادوں، کثرت سے دل ہٹادوں
قدرت سمائے مجھ میں، قدرت میں میں سماؤں

غافل خودی سے رہ کر اپنا سُروپ دیکھوں
وحدانیت کا نقشہ اس رنگ سے جماؤں

طالب نے چکبست کی طرح قومی اور مذہبی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ان میں ہو بہو وہ چکبست کی پیروی کرتے ہیں، چکبست کا ہی انداز اور چکبست کا سوز و گداز اپناتے ہیں۔ یہ نظمیں مسدس کی شکل میں ہیں۔ مذہبی نظموں میں "سری کرشن جی کی یاد" بہت ہی اعلیٰ پایہ کی نظم ہے اور موثر اندازِ بیان نے اس میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ راماین کے کئی سین کو بھی طالب نے نظم کا لبادہ پہنایا ہے۔ "سیتاجی اور راون" اس سلسلے میں بہت ہی بھلی اور انوکھی نظم ہے۔ "شیوراتری" (نظم) بھی اس سلسلے کی گراں قدر کوشش ہے۔ اس کا آغاز ملاحظہ ہو:-

کس قدر روشن ہے اپنی آج شامِ زندگی
لائی ہے شیوراتری تازہ پیامِ زندگی

(روزنامہ "مارتنڈ" ۲۹ فروری ۱۹۳۶ء)

طالبؔ نے جدید انداز میں کچھ مرثیے بھی لکھے ہیں، جن میں اپنے دوستوں اور عزیزوں کے غم کو انتہائی رقت آمیز انداز میں بڑی کامیابی سے پیش کیا ہے۔ طالبؔ نے اپنی آنکھوں سے جو انقلابات دیکھے وہی اپنی نظموں میں بیان کئے ہیں، انھوں نے وقت کے ساتھ شانہ سے شانہ ملاکر اُن انقلابات کا خیر مقدم کیا۔ اُن کے افکار و اسالیب میں جا بجا تبدیلیاں بھی نظر آتی ہیں۔ اس سلسلے میں بطورِ مثال یہ نظمیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ "بہار"، "جلوہ دلدار"، "عالمِ مجاز"۔ یہاں حفیظ جالندھری کا رنگ و آہنگ ملتا ہے ؎

بہار میں شباب ہے　　شباب انتخاب ہے
نظر کی آب و تاب ہے　　کہ حُسن لاجواب ہے
عذاب ہے، ثواب ہے　　سکون و اضطراب ہے
یہ عالمِ مجاز ہے　　کہ زندگی کا راز ہے

("عالمِ مجاز" سے ماخوذ)

"عالمِ مجاز" کی صفات ؎

کبھی خوشی ہے دمبدم　　کبھی ہے حسرت و الم
کبھی ستم پہ ہے ستم　　کبھی ہے موجزن کرم
یہ شانِ عظمت و حشم　　یہ محفلوں میں جامِ جم
یہ عالمِ مجاز ہے　　کہ زندگی کا راز ہے

"عورت" اور "سورج کی کرن" وغیرہ میں طالبؔ مستزاد کو اپنا رہے ہیں۔ "مرزا غالب" اور "نور جہاں" پر اُن کی نظمیں موثر ہیں۔ طالبؔ نے پروفیسر جیلال کول کے ساتھ "للہ وید" کی کچھ شاعری (واکھ) کا منظوم ترجمہ بھی کیا ہے یہ دراصل اُن کے طویل تحقیقی کام کا ایک سلسلہ ہے۔ "بہار گلشن کشمیر" جو کہ کشمیری شعراء کا ایک یادگار تذکرہ ہے، پر بھی انھوں نے ایک بسیط مقدمہ لکھا ہے۔ اِسکے علاوہ لالہ سری رام کی "خمخانۂ جاوید" میں انھوں نے ایک منظوم تقریظ بھی لکھی ہے اس

تفریظ میں تقریباً ایک سو مشاہیر کا ذکر آتا ہے۔ اس کا انداز اور ہیئت مثنوی کا ہے۔ آغاز تشبیب سے ہوتا ہے۔ تذکرہ کا حال دیکھیئے :-

کہیں کُرسی نشیں تھے میرؔ و سوداؔ
کہیں سوزؔ اور جرأتؔ، دردؔ و انشاؔ
کہیں تھے حاتمؔ و تاباںؔ و ناسخؔ
کہیں مومنؔ، اسیرؔ و برقؔ و راسخؔ

پروفیسر عبدالقادر سروری اپنی کتاب "کشمیر میں اردو" میں طالب کی تنقیدی بصیرت کا یوں ذکر کرتے ہیں :-

"طالب کے تنقیدی مضامین بھی رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کا مضمون "علامہ کیفی دہلوی کی یاد میں" شیرازہ (جنوری سنہ ۶۲ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں علامہ کیفی سے اپنے مراسم اور ان کی ادبی اصلاحوں کا تذکرہ کیا ہے۔ مضمون اُستاد کے ساتھ عقیدت مندی کا آئینہ دار ہے۔ اور کیفی کے ادبی مزاج کو سمجھنے میں بہت معاون ثابت ہوسکتا ہے۔ اس میں طالب کے نام کیفی کے لکھے ہوئے خطوط بھی شامل ہیں"۔

طالب کی شاعری اگرچہ مروّجہ رسم کے مطابق غزل سے شروع ہوئی۔ مگر روایتی غزل گوئی سے وہ عصری مذاق تک سفر کر گئے۔ اپنے APICS میں نظمیں لکھیں۔ "رشحاتِ تخیل" کے نام سے سنہ ۱۹۲۵ء میں اُن کا شعری مجموعہ شائع ہوا۔ اس میں غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی (قومی و مذہبی موضوعات پر) ملتی ہیں۔ سنہ ۱۹۵۲ء میں ان کا ایک اور مجموعہ "مرقعِ افکار" شائع ہوا۔ اس میں شروع سے آخر تک نظمیں ہی نظمیں شامل ہیں۔

ابتدائی غزل کے چند نمونے ملاحظہ ہوں :-

گیا دل ہاتھ سے، اور دلِ مستاں کے ہاتھ کیا آیا

اُڑا آنکھوں سے مطلب، رازداں کے ہاتھ کیا آیا
میری آنکھوں میں حسنِ یار کی تصویر پنہاں تھی
تو میرے رد کنے سے پاسباں کے ہاتھ کیا آیا

برج موہن دتاتریہ کیفی نے "مرقع افکار" کے مقدمے میں نندلال طالب کی شاعرانہ صلاحیتوں کو سراہتے ہوئے اُنھیں ایک باکمال شاعر قرار دیا ہے۔ پنڈت کیفی کے الفاظ میں:-

"طالب کے کلام میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر طرز میں اپنا رنگ جما لیتے ہیں۔ اپنے وقت پر وہ یقیناً صاحبِ طرز مانے جائیں گے۔ احساسِ قلبی کی تصویر کھینچنے میں ان کو کمال کا درجہ حاصل ہے، یہی حال حقائق نگاری کا ہے۔ مناظرِ قدرت جیسا سچا اور دلکش نقشہ کھینچنے میں تعریف کے قابل ہیں۔"

(برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی۔ جموں ۱۴ فروری ۱۹۵۲ء)

اِس طرح "رشحاتِ تخیل"، "رنگِ سخن" اور "مرقع افکار" کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ طالب میں ایک بڑا شاعر بننے کی پوری صلاحیت موجود تھی، لیکن جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ طالب شاعر ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجے کے محقق اور نقّاد بھی تھے۔ اس لئے وہ شاعری کی طرف اتنی توجہ نہ دے سکے، جتنی توجہ کی حقدار اُن کی شاعری تھی۔ پھر بھی طالب کا شعری سرمایہ اُن کے تخلیقی ذہن، قادر الکلامی اور فنکاری کا ثبوت دیتا ہے اور اس اعتبار سے طالب کشمیر کے صفِ اوّل کے اُردو شاعروں میں اہم مقام رکھتے ہیں۔

— ۰:۰ —

طبقاتی کش مکش، اونچ نیچ، غریبی اور امیری کے فرق کو وہ سمجھتے تھے، مگر اس کو اخلاقی نقطۂ نظر سے دیکھنا معیوب نہ سمجھتے تھے۔

شہ زور بسیار گو ہیں، لیکن بسیار گوئی نے انہیں کہیں بھی بلند مرتبہ سے نہیں گرایا۔ وہ فن کا مینار تھے اور مینار ہی رہے۔ انھوں نے اپنی نظموں کا ایک مجموعہ کشمیر اور کشمیر کے مناظر پر شائع کیا۔ اس مجموعہ میں "وادیٔ کشمیر" "شالامار باغ"۔ "پری محل" اور "شفقِ شام جھیل ڈل کے کنارے" بڑی قابلِ قدر نظمیں ہیں۔ فنی اعتبار سے یہ نظمیں کسی بھی اُردو کے بڑے شاعر کی نظموں کے مدِ مقابل رکھی جا سکتی ہیں۔ یہ نظمیں بظاہر رسمی اور روایتی موضوعات کو چھیڑتی ہیں، لیکن ہمارا یہ شاعر مناظر سے گزر کر روحِ حُسن تک پہنچتا ہے۔ وہ ماضی کی یادوں کو، جو رومانی بھی ہیں اور تاریخی بھی، اس طرح قاری کے سامنے پیش کرتا ہے کہ قاری ان میں نہ صرف کھو جاتا ہے، بلکہ تہہ در تہہ ایک نئی ہی دُنیا بھی پا لیتا ہے۔ جس میں رنج و غم، نشاط و الم کے سوا اور بھی کچھ ہوتا ہے۔

"وہ افلاس کی اٹھتی ہوئی نظروں کو زر کے تودوں کی طرف بڑھتے بھی دیکھ لیتا ہے اور نغموں کی تہہ میں دبی دبی کراہ کو بھی سُن سکتا ہے پھر خیالات کا سلسلہ اس حقیقت۔ نفس لامری کی طرف رہبری کرتا ہے کہ:-

یوں ہی یہاں سے جانے کتنے گذر گئے ہیں
آئے تھے یہ کہاں سے آ کر کدھر گئے ہیں[۱]"

فسادات پر شہ زور نے بڑی اچھی نظمیں لکھی ہیں۔ کشمیر کے تقریباً سبھی شاعر علامہ اقبال کے فکر و فن سے متاثر ہوئے ہیں۔ شہ زور بھی انہیں اس طرح خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں:-

---

[۱] "کشمیر میں اُردو" از پروفیسر سرداری۔

حکیم امتِ مرحوم، آشنائے راز
تھی جس کے فکر کے طائر کی عرش تک پرواز
وہ جس نے ذہن کی افتادگی کو رفعت دی
وہ جس نے فکر کی پژمردگی کو نزہت دی
بُلند جس نے کیا ہند میں نوائے خودی
وہ سارے شرق کا اقبال وہ خدائے خودی

اپنی زبان دانی اور خیالات کی وسعت پر ناز کرتے ہوئے یوں فرماتے ہیں:۔

میں نے جذبات کو کونین کی وسعت دی ہے
فکر کو کنگرۂ عرش کی رفعت دی ہے
نطق کو کوثر و تسنیم کی عزت دی ہے
اور تخئیل کو شادابیٔ جنت دی ہے

٭

تم مجھے ذہن بدر، ملک بدر کر دو گے
زہر سے ساغرِ امید مرا بھر دو گے

٭

سب کو اک مرکزِ اُلفت سے پکارا میں نے
کیا کوئی روپ ہے ایسا جو نہ دھارا میں نے

حُب الوطنی سے بھرپور نظم ملاحظہ ہو:۔

ہیں لالہ و گل رد کشِ حورانِ جناں آج
صد غیرتِ تسنیم ہے ہر جوئے رواں آج
ہر ایک شجر سدرہ و طوبیٰ ہے یہاں آج
ہر شاخ نشیمن پہ ہے گلبانگ جواں آج
ہے وادیٔ کشمیر پہ جنت کا گماں آج

غنچوں کے لبوں پہ ہے محبت کا تبسم
سبزے کا سراپا ہے مسرت کا تبسم
ہر منظرِ گلشن ہے قیامت کا تبسم
کانٹوں نے بھی سیکھی ہے محبت کی زباں آج
ہے وادیٔ کشمیر پہ جنت کا گماں آج

گُل خیز ہے، گُل بار، گُل پوش ہے کشمیر
کیفیت و تنویر کی آغوش ہے کشمیر
اک حجلۂ رنگیں ہیں نواجوش ہے کشمیر
کشمیر نہاں رہ کے بھی ہے خوب عیاں کشمیر
ہے وادیٔ کشمیر پہ جنت کا گماں آج

مے ریز فضائیں ہیں، گھٹائیں ہیں گُہر بار
سرشار ہیں اشجار تو بدمست ہیں انہار
بارش کی چھما چھم ہے کہ پازیب کی جھنکار
ہے صحنِ چمن رقص گہہِ زہرہ وشاں آج
ہے وادیٔ کشمیر پہ جنت کا گماں آج

اپنے عہد کے فنی اور سماجی شعور کو غزل میں سمونے کی کوشش دیکھیے:-

میرا گوہرِ سخن جو ترے کان تک نہ پہنچا
مرے کم نصیب فن کا وہی شاہکار کیوں ہو

⁂

المدد! اے تصورِ جاناں   تا بحدِ نظر ہیں ویرانے
یہ تعلق بھی کیا قیامت ہے   تم نہ میرے ہوئے نہ بیگانے

⁂

نئی غزل کا نیا آہنگ رمزیت کے ساتھ ملاحظہ ہو:-

دامانِ گلستاں پر ہے خزاں پھر سایہ فگن اب کیا ہوگا
آغوشِ محن اور سرو سمن، یارانِ چمن اب کیا ہوگا

میخانہ نیا، ساغر بھی نئے، ساقی بھی نیا، مے کش بھی نئے
تجھ سے اک کیف نیا حاصل، صہبائے کہن اب کیا ہوگا

خوں بار شفق ہے کیا جانے، کتنوں کا سہاگ اُترا دن میں
ہے شام کے سر پر کالا کفن، اے شب کی دلہن اب کیا ہوگا

شہزور دہ حق بیں، حق گو، منصور کا جو ہم مشرب ہے
ہیں اس سے خفا یارانِ وطن، اے دار و رسن اب کیا ہوگا

⁘

اصناف میں ایجاز کا فن، چند قطعات اس سلسلے میں ملاحظہ ہوں:-

جنوں میرا تو میرا ہی جنوں ہے — نہ کیوں حیراں ہوں اربابِ ادراک
جنوں کا مظہرِ اکمل ہوں لیکن! — گریباں ہے نہ دامن ہی مرا چاک

⁘

حدیثِ شوق میری مقتضی ہے — کہ اپنی زیست کے ٹکڑے ملالوں
اگر زحمت نہ ہو، اے موت آجا — میں اپنی عمرِ رفتہ کو منالوں

⁘

رباعیات ملاحظہ ہوں:-

بے سود ہے تہدیدِ عقل و دانش — اور راہنما کی یہ جہد و کوشش
ٹھوکر ہی سکھاتی ہے سنبھل کر چلنا — تقویٰ ہے حقیقت میں شعورِ لغزش

⁘

اے بے خبر از موجود لا موجود — ہیں دہر میں لاکھوں دنیا نا مشہود
محدود جہاں ہو یہ ناممکن ہے — اک ذرّہ نہیں اس دنیا میں محدود

⁘

حاکمِ سیلِ جبر ابھی تند و تیز ہے — ہر اک دیار آج بھی محکوم خیز ہے
خواجہ پرست آج بھی مزدور ہے یہاں — پائے خدائے زر پہ گدا سجدہ ریز ہے
خونخوار ذہنِ قیصر و مغفور ہے ابھی
اے وقت دورِ امن و سکوں دُور ہے ابھی

⁘

زبان پر قدرت اور خیالات کی وسعت ملاحظہ ہو :-

صُبحیں جو معطّر ہیں تو شامیں ہیں منوّر
پُرکیف جو راتیں ہیں تو دن مست ہیں یکسر
ہر لمحہ جمیل و مترنّم ہے سراسر
ہر آن طرب ناک ہے اور بادہ چکاں آج
ہے وادیٔ کشمیر پہ جنّت کا گماں آج

خاموشیٔ اشجار میں ہے جوشِ تکلّم
مستانہ ہواؤں میں ہے آہنگ و ترنّم
بادۂ تقدیس کے ساغر چھلکتے ہیں یہاں — گل چٹکتے ہیں یہاں بُلبل چہکتے ہیں یہاں
عود کی خوشبو سے ہے ساری فضا مہکی ہوئی
انتشارِ کیف سے ساری فضا بہکی ہوئی
سُرخ رنگوں سے ہے یوں خاکِ چمن لہکی ہوئی
ہو چمن میں جس طرح گل کی قبا دہکی ہوئی

— ⁘ —

شوریدہ کاشمیری

آپ کا پورا نام غلام محمد شوریدہ کاشمیری ہے۔ وادیٔ کشمیر کے بر سر بر آوردہ شاعر، شوپیان کے ایک موضع بنجورہ میں پیدا ہوئے۔ سنِ پیدائش ۱۹۳۴ء اور خاندانی پیشہ زراعت ہے۔ غیر تعلیمی ماحول میں شوریدہ نے فارسی اور اُردو میں ایم اے کیا۔ لیکچرار کے عہدے تک پہنچے۔ پچھلے کئی سالوں سے تحقیق کا کام کر رہے ہیں۔

شوریدہ ایک بالغ نظر شاعر اور ادیب ہیں۔ بسیار گو ہیں، کافی کلام جمع کیا ہے۔ اپنی محنت اور ریاضت سے اُردو کے ایوانوں تک رسائی حاصل کی۔ شعر و سخن کے ہر علاقے سے باخبر ہیں۔ سنجیدہ و مزاحیہ دونوں اصناف پر ان کو دسترس حاصل ہے۔ شروع میں آثر صہبائی سے مشورۂ سخن کیا، پھر ان تھک محنت نے انہیں استادِ کامل بنا دیا۔ اور اب وادی کے اچھے اور صاحبِ فکر شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ شاعری کی تقریباً ہر صنف پر طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن ان کی غزل گراں قدر اور قابلِ ذکر ہے۔

شوریدہ کبھی بھی کسی خاص اسلوب میں نہیں لکھتے، کبھی وہ سنجیدہ لکھتے ہیں اور کبھی اُن کے اس سنجیدہ آہنگ میں اندر ہی اندر مزاح کی شوخیاں بھی

استفسارانہ اور استفہامیہ انداز اور لب و لہجہ میں بات کرنا اُن کا خاصہ ہے۔ وہ اُلجھی ہوئی صورتِ حال کو سوچنے اور سُلجھانے کے عمل سے فکری بنا کر اس طرح قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ استفہام گا ہے گا ہے خود اپنا جواب آپ بن جاتا ہے۔ گویا وہ اَن کہی بات سے ہی جواب اخذ کرتے ہیں اور یہیں پر اُن کا طنز نمودار ہوتا ہے ؎

تری طرح کوئی عکسِ خیال ہوں میں بھی
ہوا جواب دے میرا، سوال ہوں میں بھی

⁘

منظر کھلا تھا ایک سا دریچے کی پشت پر
آوارہ انگ انگ نگاہِ قیاس تھی

⁘

رقم ہوا ہوں یقین و قیاس دونوں میں
کرے تو کیسے کرے میرا تجزیہ کوئی

⁘

چلو! یہ مان لیا بہہ گیا شفق کا لہو!
مگر وہ رنگ جو سوکھے تھے اب ہیں نم کتنے

⁘

ہے آرزو یہی کسی مصنف میں مل سکے
وہ سختیٔ عمل جو مرے قاتلوں میں تھی

⁘

حصارِ ابرِ سیاہ توڑ کے میں آیا ہوں
قبول کر لو مجھے آفتاب جیسا ہوں

⁘

گماں بدوشِ صفِ دوستاں میں بیٹھا تھا
وہ شخص اس سے زیادہ تباہ کیا ہوتا

⁘

سُوکھا ہے بادل کا سایہ
پانی بھی کتنا پیاسا ہے

⁘

صحیفہ اُن بدن کا بے ورق ہے
بہت محدود ہے معنی کا دامن

⁘

ہاتھ اپنے قلم کر لوں گا اے اہلِ قلم میں
اک نقش کہ شیشے کا ہے آنکھوں میں رکھو تو

— ⁘ —

پنڈت دینا ناتھ نادم

آپ مارچ ۱۹۱۶ء میں سرینگر کے متوسط خاندان میں پیدا ہوئے۔ صغیر سنی میں ہی والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ والدہ کی انتھک جد و جہد اور مشقت سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ کالج کی انتہائی تعلیم مشکل سے پوری کی اور محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے مدرسی کے زمانے میں اُردو شعراء کے کلام کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ شعر و سخن سے چوں کہ بچپن سے ہی رغبت تھی۔ اس لئے جلد ہی خود بھی شعر کہنے لگے۔ شروع میں چکبست سے متاثر ہوئے، نظموں میں چکبست کا لہجہ جھلکنے لگا۔ پھر جوش و خروش سے ترقی پسند تحریک میں شامل ہو گئے۔ پہلے نادم کشمیری کے نام سے لکھتے رہے پھر سحر مشرقی کے نام سے بھی بہت کچھ لکھا۔ کشمیر میں اردو شاعری اور ادب کو ترقی پسند تصورات سے روشناس کرانے والے اولین ادیبوں میں نادم بھی شامل ہیں۔ نادم آج کل کشمیری کے سربرآوردہ شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ لیکن انکی شاعری کا آغاز بھی اردو سے ہوا۔ سنہ ۳۶ء میں نادم تحریکِ آزادی میں شامل ہوئے۔ اُن دنوں ان کا لب و لہجہ صرف سیاسی تھا۔ وہ چونکہ ان دنوں باغی تھے اس لئے اُن کی شاعری بھی عوام کو بھڑکانے اور بغاوت پر اُبھارنے والی تھی۔ نادم کی ان نظموں پر لاہور کے مشہور مزدور شاعر "احسان دانش کا بہت اثر تھا۔ اس نظم نگاری کا سلسلہ سنہ ۴۱ء تک جاری رہا۔ اسی دوران انھوں نے غزل کی طرف توجہ دی اور کئی اچھی غزلیں کہیں۔ غزل عموماً وہ سحر مشرقی کے نام سے لکھتے تھے۔

نادم کی شاعری میں کلاسیکی رنگ بھی ہے اور رومانی مزاج بھی، وہ ترقی پسند بھی ہیں اور دردوں بین بھی۔ لیکن ان کے یہاں جدیدیت کی آنچ اتنی مدھم ہے کہ اس کی حلاوت کا احساس جلد ہی نہیں ہو پاتا۔ آیئے اُن کی ہمہ جہت شاعری کے چند رنگ دیکھیں

سرمستی و سرشاری اور تاثیر و دل فگاری غزل سے یوں عیاں ہے۔

(۱)

اسیرِ عشق ہوا، آبرو کی خاک اُڑی — زباں پہ حرفِ وفا صورتِ سوال آیا

(۲)

کھلی رہے گی پسِ مرگ چشمِ تر میری — کہ وا رہیں درِ دل تیرے آنے جانے کو

(۳)

مجھے تمہارا تصور، تمہیں خیالِ رقیب — میں یاد آنے کو رو دوں کہ بھول جانے کو

(۴)

سحر تو فکرِ عمل سے جو بے نیاز ہوا — زیاں و سود کو دریا میں جا کے ڈال دیا

⁂

رات کا پچھلا پہر تارے ہوئے ہیں محوِ خواب — دامنِ بادل میں جا کر سو چکا ہے آفتاب

پھر رہے ہیں چار سُو مایوس ٹکڑے ابر کے — گھاٹیوں میں کنگروں پر اونگھتے ہیں دھند لکے

ایک ٹوٹا جھونپڑا محزوں سا ویرانی میں ہے — شب کا سایہ صبح کے بہتے ہوئے پانی میں ہے

(ایک نظم کے چند اشعار)

نادم پہلے اُردو میں کہتے تھے۔ مہجور سے ملاقات کے بعد انھوں نے کشمیری میں کہنا شروع کیا۔ اس طرح ایک ذہین، زود فہم، سخن شناس اور سخن سنج اُردو شاعر اُردو سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دور ہو گیا اور کشمیری کا شاعر ہو کر رہ گیا۔ اُن کی ادبی خدمات کے عوض انھیں کئی قومی اور بین الاقوامی انعامات اور اعزازات سے بھی نوازا گیا

ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد للہ دید ہائر سیکنڈری اسکول کے اعزازی صدر کی حیثیت سے آج کل اپنی "جیون نیا" چلا رہے ہیں۔

- ⁂ -

قیصر قلندر

اِن کے اب تک دو شعری مجموعے (۱) "سازِ جمال" - (۲) "سازِ آرزو" شائع ہو چکے ہیں
ایک عرصہ تک آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ رہنے کے بعد اب اپنے فرائض سے
سبکدوش ہو گئے ہیں۔ لیکن اُن کا تخلیقی سفر اب بھی پورے زور و شور سے جاری ہے۔
قیصر قلندر کشمیر کے ان اُردو شاعروں میں سے ایک ہیں، جنھوں نے کم و بیش اُردو
شاعری کے تمام رجحانات کو دیکھا اور برتا ہے۔ قیصر قلندر کا اسلوب جدید ہے، لیکن
اُن کی جدت پسندی میں اُردو کی کلاسیکی شاعری کی آنچ بھی موجود ہے۔ اسی لئے
اُن کی شاعری ہر حلقے میں پسند کی جاتی ہے۔ قیصر قلندر کی شاعری کے مختلف
رنگوں کا اندازہ اُن کے درجِ ذیل اشعار سے لگایا جا سکتا ہے ؎

جب درد کی شمعیں جلتی ہیں احساس کے نازک سینے میں
اِک حسن سا شامل ہوتا ہے، پھر تنہا تنہا جینے میں

آغوشِ تمنا چھو آئیں جب زُلفِ یار کی خوشبوئیں!
آنکھوں میں ساون لہرایا، دیپک سے سُلگے سینے میں

پلکوں کے سُلگتے تاروں سے میں رات کی افشاں لا نہ سکا
شعلوں کو چھپائے پھرتا ہوں میں دل کے ایک نگینے میں

یہ رنگ حیا، احساس طرب، آئینہ رُخ میں عکس فگن
اِک تابش تیرے چہرے کی، اِک آنچ سی میرے سینے میں

ایک اور غزل کے چند اشعار ؎

پھول سی باتوں کا چلتا ہے ہمیشہ جادو
نیم خواب آنکھوں میں پلتا ہے ہمیشہ جادو

جلے احساس کی رگ رگ سے شرارے ٹپکیں
یاد کی آگ سے جلتا ہے ہمیشہ جادو

جاگتے لمحوں میں تلخابۂ شیریں کی خوشبو
رات کا دل بھی نگلتا ہے ہمیشہ جادو

زلف کے ساتھ مہکتا رہا افسونِ غزل
شعرِ قیصر سے سنبھلتا ہے ہمیشہ جادو

نظم میں حفیظ جالندھری کا انداز :-

حیات نغمہ زار ہے، خیال زرنگار ہے
برس رہی ہیں مستیاں، فضا پہ اک خمار ہے

چمن چمن گلوں کی آگ کتنی خوشگوار ہے
رباب چنگ بج رہے ہیں، سرودِ آبشار ہے

نظم میں کلاسیکی انداز :-

گھٹا اس کاکلِ پُرپیچ کی برسات لے آئی
عروسِ شعر و نغمہ ساتھ اپنے رات لے آئی

اُس کے جلو میں :-

گداز نیم شب، آہوں کے نغمے، بربطِ انجم
صبا کا لوچ، غنچوں کا تبسم، بادۂ شبنم

مئے افکار و بزمِ ماہ و مینائے غزل لائی
لبوں کے احمریں مصرعے دل آرائے غزل لائی

جدید انداز کی نظم "لال چوک" (جو "ہمارا ادب ۶۴-۶۲ء" میں شائع ہوئی)

زندگی مدتوں سے رہی مضطرب
پردۂ ساز میں جیسے نغموں کے دل

وقت کے جسم ہی میں دھڑکتے رہے
سخت حالات اور نرم لمحوں کے دل

گیسوئے گل کی خوشبو پریشاں رہی
اور پتنگے جلے، جیسے شمعوں کے دل

ایک اور نظم کے چند اشعار :-

سازِ ایام اُٹھاؤ کہ سنیں گے نغمۂ گل
عمرِ رفتہ کو ذرا لاؤ کہ ہم آئے ہیں

چار سُو جلوۂ معبود کی رعنائی ہے
عشق کی گرمی و تندی سے ہوا ہے ظاہر

خود ہی شاہد ہے وہ معبود کہ عبد اور معبود
گلشنِ خواجہ لطلہ سے کئی گل پھوٹے

کوہ ماراں بکمر لعلِ بدخشاں دارد
ایں چنیں بحث کجا تختِ سلیماں دارد

- .:. -

پنڈت دینا ناتھ چکن مستؔ

آپ کشمیر کے ایک کہنہ مشق سخن سنج ہیں۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں اسلام آباد (کشمیر) میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد پنڈت آنند چکن مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے پرائیویٹ سیکریٹری رہ چکے ہیں۔ مستؔ نے اپنی تعلیم میٹرک تک سرینگر میں حاصل کی۔ لاہور کے رسالہ "صبح کشمیر" کے مدیر رہے۔ لاہور سے لوٹنے کے بعد امریکن ایمبیسی میں ملازم ہو گئے۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں پنڈت کیفی سے تعارف ہوا اور ان کی کاوشوں سے شعر و شاعری کے میدان میں کود پڑے۔ پہل غزل سے کی، پھر نظم کی طرف مڑ گئے۔ مشقِ سخن جاری رکھی اور اچھے شاعروں میں شمار ہونے لگے۔ مستؔ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جذبات سے بھرپور ہیں۔ مستؔ کی غزل رومانی ہے، نظم میں منظر کشی اور شالی "کشمیری پن" سے وہ انفرادیت پیدا کرتے ہیں۔ مستؔ نے قومی اور وطنی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ سماجی شعور مستؔ کی نظموں کی ایک اہم خصوصیت ہے :-

بہت صدمے سہا کرتا ہوں میں تیری محبت میں\
رہینِ گریۂ پیہم رہا کرتا ہوں خلوت میں

چراغِ برق کی صورت دھنواں اُٹھا نہیں لیکن\
سراپا داغِ دل سے جل اُٹھا میں سوزِ اُلفت میں

تری مُرلی کا نغمہ گونجتا رہتا ہے کانوں میں\
نظر آتا ہے تیرا روپ اب ہر ایک صورت میں

ایک اور غزل کے چند اشعار :-

کیوں کسی کے لئے تو روتا ہے	ہار موتی کے کیوں پروتا ہے
یاس و حرماں، جنون و رسوائی	عشق میں بس یہی تو ہوتا ہے

مست سمجھا ہے زندگی جس کو!
موت اُس کا مآل ہوتا ہے

چکبست کو خراجِ عقیدت:-

آہ! اے چکبست اے روحِ روانِ شاعری
ہو گیا خاموش تو اے نغمہ خوانِ شاعری

خوگرِ حبِ وطن تھا، عاشقِ زارِ چمن
تیرے شعرِ تر سے تھا سرسبز گلزارِ وطن

کوئی سما سکے گا کیا دیر و حرم کی قید میں
ٹھہرے جو لامکاں کوئی اس کا ہو کیوں مکاں الگ

ایرج کاشمیری

مظفر ایرج کاشمیری سنہ ۱۹۴۷ء میں سرینگر کے محلہ صفا کدل میں پیدا ہوئے۔ یہیں تعلیم پائی اور ہینڈ لوم تیکنالوجی میں ڈپلوما حاصل کر کے جموں و کشمیر انڈسٹریز میں ملازم ہوئے۔ شعر و سخن کا فطری ذوق تھا۔ چنانچہ ملازمت کی غیر شاعرانہ فضا میں بھی اپنے ذوق کی پرورش میں مصروف ہیں۔ جدید غزل گو ہیں۔ رمزیہ علامات، قافیوں کی نیرنگی، موضوعات اور اسلوب کا نیا پن انھیں کشمیر کے جدید غزل گو شعراء میں ایک ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔ غزل کے علاوہ نئی نظم بھی لکھتے ہیں۔

نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

اس عالمِ نفسا نفسی میں ہم چاک گریباں کیا ڈھونڈیں
آدابِ سخن معلوم نہیں، اندازِ سخنداں کیا ڈھونڈیں
اک دورِ تلاطم ہے برپا، جذبات کے گوشے گوشے میں!
کیوں ہنگاموں کی فکر کریں اور شورشِ زنداں کیا ڈھونڈیں

اے دوست! محبت میں تاثیر عجب دیکھی
ہم دور ہیں منزل سے اور سامنے منزل ہے

نقشِ کہن مٹائیں گے آج نہیں تو کل سہی
جوت نئی جلائیں گے آج نہیں تو کل سہی

جوشِ جنوں میں دوستو اپنی ہی وحشتوں سے ہم
عمر کچھ اور بڑھائیں گے آج نہیں تو کل سہی

غلام محمد میر طاؤس

آپ پانپور کاشمیر میں ۲۲ مئی ۱۹۱۹ء کو پیدا ہوئے۔ پانپور، کشت زعفران کی بدولت دنیا بھر میں مشہور ہے۔ طاؤس صاحب کے والد کا نام حاجی سیف اللہ تھا۔ جو اپنے وقت کے اچھے شاعر اور نثر نگار تھے۔ طاؤس نے ابتدا میں اپنے والد سے ہی فن شعرو سخن سیکھا اور کالج کے زمانے میں ان کی شاعری میں نکھار آیا۔ اور وہ اپنے والد سے بھی آگے نکل گئے۔ ۳۸ء تک طاؤس اچھے خاصے شاعر بن چکے تھے۔ طاؤس صاحب غ۔م۔ طاؤس کے نام سے ادبی دنیا میں جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے نئے عہد کے تقاضوں اور ادبی معیاروں کو بڑی خوبی سے اپنے تخلیقی سفر میں جذب کیا۔ وہ کشمیر کی ادبی دنیا میں ثاقب کی طرح عیاں ہوئے۔ ایک طرف ملازمت کی ذمہ داریوں کو نبھاتے رہے اور دوسری طرف شعر و ادب کی تخلیق بھی کرتے رہے۔ گھر کے ادبی ماحول نے ان کو لکھنے پر آمادہ کیا تھا اور انھوں نے اس چیلنج کو نہ صرف پایۂ تکمیل تک پہنچایا، بلکہ اس میں نئی جہتیں اور نئے اضافے بھی کئے۔

اُن کا ادبی سفر رسالہ "پرتاپ" سے شروع ہوا۔ پھر ملک کے دوسرے مقتدر رسالوں میں بھی شائع ہونے لگے۔ "پرتاپ" کے ایڈیٹر بھی چنے گئے۔ علی گڑھ سے ایم۔اے ایل۔ایل بی کے امتحانات پاس کئے۔ ۴۴ء میں سرکاری ملازم ہوتے اور اپنی ذہانت کی بدولت محکمۂ امور خارجہ کے سکریٹری کے عہدے تک پہنچے۔ اب وظیفہ حسن خدمت پر ہیں۔

طاؤس نے اپنا شعری سفر غزل شروع کیا۔ لیکن غزل میں وہ محض روایت پسندی کے مقلد نہ رہے بلکہ انھوں نے نئے عہد کے شعور اور نئی تحریکوں کے اثر سے اپنی غزل

کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ اُن کی غزلوں میں تجربات اور مشاہدات بدرجۂ اتم نظر آتے ہیں۔ پھر حالات نے انہیں نظم کی طرف مائل کر دیا۔ لیکن انھوں نے نظم میں بھی اپنے تجربوں سے ایک انفرادی چمک پیدا کی۔ وہ شروع میں اقبال اور حفیظ سے متاثر نظر آتے ہیں۔ پھر تجربے کی بالغ نظری نے انہیں غالب کا گرویدہ بنا دیا۔ چنانچہ غالب کی مشہور زمین میں انھوں نے ایک نظم لکھی ؎

زندگانی میں میسّر ہو مجھے دل کا سکوں

موت آجائے تو مر کر نوحہ خواں کوئی نہ ہو

دیارِ مغرب کے تہذیب و تمدن کا یوں مضحکہ اُڑاتے ہیں:۔

جسے اہلِ جہاں سرچشمۂ تہذیب کہتے تھے — وہ جس کی خام کاری کو نئی ترکیب کہتے تھے

اُخوت اور آزادی پہ کہتے تھے جو قرباں ہیں — وہی قومیں معاذ اللہ! باہم دست و گریباں ہیں

جنہیں دعویٰ تھا دنیا بھر میں اپنی رہنمائی کا — وہ رو رو رہے ہیں آج اپنی نارسائی کا

بھلا تہذیبِ حاضر کا یہی انجام ہونا تھا

ہزاروں بے گناہ لوگوں کا قتل عام ہونا تھا

انھوں نے غالب کی طرح نامساعد حالات میں بھی زندگی قدر جانی ہے ؎

نغمہ ہائے غم کو بھی، اے دل غنیمت جانیے

بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

طاؤس کی نظموں میں ہمیں جیتا جاگتا انسان نظر آتا ہے۔ وہ اس کے غم اور اس کی خوشی میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ وہ حقیقت پرست اہلِ نظر کی طرح زندگی اور اس کے جملہ نارسائی کے مناظر اس طرح بیان کرتے ہیں کہ مظلومی، ناداری، بے کسی اور بے بسی کی تصویر ہو بہو آنکھوں کے سامنے آتی ہے۔ وہ زندگی کے روشن پہلوؤں سے آنکھیں نہیں چراتے بلکہ خوشی کو قدرت کی ایک نعمت جان کر یوں فرماتے ہیں ؎

قسم اس آہ کی جو رات کی گہری خموشی میں

کسی مظلوم کے مجروح سینے سے نکلتی ہے

قسم اُس قوم جو آفتوں، صدموں کے نرغے میں
یکایک اُٹھ کے گرتی ہے مگر گر کر سنبھلتی ہے

مجھے اس خاکداں سے پھر بھی بے پایاں محبت ہے،
یہ جینا کچھ بھی ہو لیکن مجھ جیسے سے اُلفت ہے،

طاؤس کو وطنی نظمیں لکھنے کا بے حد شوق ہے۔ اپنی جنم بھومی پانپور کے زعفران زاروں کا وہ بڑی دلکشی سے ذکر کرتے ہیں۔ اِس سلسلے میں اُن کی نظم "چندن ہار" نمونے کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔ اس نظم کا مرکزی کردار "حبہ خاتون" ہے۔

اِن ٹیڑھے ترچھے کھیتوں پر جب حسنِ بہاراں مچلا تھا
اِس گیلی پیلی مٹی نے اک شوخ شرارہ اُگلا تھا
جب آنگن میں اک کٹیا کے اک شہ کا پاؤں پھسلا تھا
اک درد کا لاوا ابلا تھا، اک نور مجسم پگھلا تھا

طاؤس کا لہجہ نرم، اسلوب دلنواز اور چھوٹی بحروں کا استعمال ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ غزل میں تیکھا انداز دیکھئے :-

آ۔ کہ بہار آ گئی پھول کھلے ہیں سو بہ سو
دیکھ یہ بوستانِ رنگ، دیکھ یہ گلستانِ بو

میں ہوں ایک تشنہ کام، محفلِ انبساط میں
مضطرب و شکستہ جام منتظر و تہی سبو

آ۔ کہ تیرے بغیر ہے میرا شباب سوگوار
تیرے بغیر نوحہ خواں کشتِ گل و کنارِ جو

غرض کہ طاؤس کے یہاں کلاسیکی آہنگ بھی ہے اور ترقی پسندی کی آنچ بھی۔ وہ کبھی کبھی "دروں بینی" پر بھی مجبور نظر آتے ہیں۔ وہ روایت پسند بھی ہیں اور اس کے باغی بھی۔ بالفاظِ دیگر وہ وقت کے بہاؤ کے ساتھ بہتے ہیں اور وقت کے تقاضوں اور ضرورتوں کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ اُن کا مجموعۂ کلام ۱۹۸۲ء میں "موج موج" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

— ⁘ —

سیف الدین سیفی

آپ ۱۹۲۲ء میں کشمیر کے مشہور قصبہ سوپور میں تولد ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد مولوی غلام رسول سے پائی۔ عربی و فارسی کے امتحانات امرتسر سے کامیاب کئے۔ محکمہ تعلیم میں مدرسی سے لے کر تحصیل ایجوکیشن آفیسر کے عہدے تک پہونچے۔ اُن کا تعلق مولانا محمد انور شاہ (جید عالمِ دین اور مسلم مفکر) کے خاندانِ رشد و ہدایت سے ہے۔ سیفی نے مذہبی و علمی ماحول میں آنکھ کھولی۔ مذہب سے فیض و برکت اور روحانی تسکین پائی اور علم سے ذہنی و فکری روشنی۔ ان دونوں چیزوں کو کثرت سے استعمال کیا۔ شعر و سخن کا سفر میٹرک سے شروع کیا۔ اور آج اپنی کبیر سنی میں بھی اس سفر کو زور و شور سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی شاعری کی عمر تقریباً چالیس سال ہے۔ اس طویل مدت میں انہوں نے اپنی اَن تھک محنت اور ریاست سے شاعری کے جملہ رموز و نکات کو سمجھا اور برتا ہے۔

سیفی کشمیر کے صاحبِ فکر و فن شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری کی شروعات رواج کے مطابق غزل سے کی ہے۔ لیکن تجربے اور شوقِ تجسس نے اُنہیں نظم لکھنے پر مجبور کر دیا۔ اُن کی نظمیں زمانے کے تقاضوں کو نہ صرف پورا کرتی ہیں، بلکہ نظم میں نئی وسعتیں اور جہتیں بھی پیدا کرتی ہیں۔ اُن کی غزلیں فن کارانہ رموز و نکات سے مزین ہیں اور وہ

اساتذہ کی طرح پختہ غزل کہتے ہیں۔ غزل کے موضوعات کو کامیابی سے برتنا آپ کا محبوب مشغلہ ہے۔ وہ غزل کے رنگ اور آہنگ کو ہر صورت میں قائم رکھتے ہیں۔ اُن کا فن کلاسیکی لوچ اور ترقی پسندی کی مقصدیت لئے ہوئے نظر آیا ہے۔ آیئے! اُن کی غزل کے چند شعر دیکھیں :- ؎

خامشی میری بہ انداز فغاں ہے کہ نہیں
دل کی ہر بات نگاہوں سے عیاں ہے کہ نہیں

تیرے ہونٹوں پہ تبسم کی دمکتی تحریر
ایک مُنہ بولتا منشورِ اماں ہے کہ نہیں

پھونک ڈالا تھا کبھی جس نے مرے دل کا سکوں
اب وہ آتش بہ جگر شعلہ بجاں ہے کہ نہیں

چھوٹی بحر دل میں رواں اشعار :-

جن پر فدا ہوں آسماں کے ستارے
نظر میں کچھ ایسے بھی ہیں ماہ پارے
ہے سرمایۂ زندگی یاد اُن کی!
جو لمحے ترے ساتھ ہم نے گزارے

سیفی کی نظم "مسافر" کی ایک جھلک :-

وہ دیکھئے شام ہو چکی ہے
غروب کے بعد سحر کی وادی میں چپکے چپکے سیاہی شب اُتر رہی ہے
جو نغمے تھے خاموش ہو گئے ہیں
ہوا بھی ساکت ہے جیسے تھک کر ٹھہر گئی ہو۔

—:—

بشارت سلیم

آپ کی پیدائش ۱۴ اگست سنہ ۱۹۳۱ء کو سرینگر میں ہوئی اور آپ کی ادبی زندگی کا آغاز آپ کے ہوش سنبھالنے کے ساتھ ہی ہوا۔ آپ کے والد مرحوم صاحبزادہ غلام محی الدین خان جو اعلیٰ سرکاری منصبوں پر فائز رہے۔ اُردو، انگریزی، فارسی اور عربی کے ایک جیّد عالم ہونے کے علاوہ ایک ایسے عالی مرتبت خدارسیدہ بزرگ بھی تھے، جن میں روحانیت میں ڈھلا ہوا تب و تاب گہر موجود تھا۔ آپکی پیدائش جس گھرانے میں ہوئی وہ ہمیشہ علم و ادب، عرفان اور سیاست کا گہوارہ رہا ہے۔ جہاں اخلاقیات اور ایک ربطِ خاص کا دور دورہ تھا۔ عام طور پر خوشحال گھرانوں کے بچّوں کے شب و روز کھلونوں اور دل بہلاوے کی بھول بھلیوں کے سہارے گذر جاتے ہیں۔ لیکن آپ کی کیفیت سراسر مختلف تھی۔ بقول بشارت سلیم صاحب :-

"اپنے بازو گھر میں جا ہے جس سمت بھی پھیلاتا۔ میرے ہاتھ میں کوئی کتاب ہی آتی، کوئی رسالہ کوئی میگزین یا کوئی اخبار ہی آتا۔ مجھے اب بھی یاد ہے "پیسہ" اخبار سے لے کر "زمیندار" تک اور "الہلال" سے کر "نیرنگِ خیال" اور "مخزن" تک ان گنت اخبار اور رسائل کے علاوہ قائدِ اعظم مرحوم کے اخبار "ڈان ٹائمز" سے لیکر "سول اینڈ ملٹری گزٹ" تک کئی انگریزی اخبار اور غیر ملکی میگزین باقاعدگی کے ساتھ والد مرحوم کے نام آتے۔ والد مرحوم چونکہ ماہرِ اقبالیات بھی تھے اس لئے اقبال مرحوم کی کتابیں میرے گرد و پیش رہتیں۔ علم و ادب کی دلچسپی میرے نفس نفس میں سما گئی۔ میرے ذوقِ لطیف کی آبیاری ہوتی رہی اور ذہن میں نقوشِ سیمیں اُبھرتے گئے اس طرح پڑھنے لکھنے کا آسودہ شوق مجھے ورثے میں ملا ہے۔"[1]

---

[1] بشارت صاحب نے راقم سے ایک انٹرویو کے دوران ان باتوں کا انکشاف کیا تھا۔

آپ کی سنجیدہ ادبی زندگی کا آغاز اس وقت ہوا۔ جب آپ نے میٹرک کا امتحان پاس کرکے سرینگر کے ایس۔ پی کالج میں داخلہ لیا۔ شروع میں آپ نے افسانہ نگاری کی اور پھر شاعری۔ "حلقۂ شعروادب" کے جنرل سکریٹری بھی رہے۔ میگزین "لالہ رُخ" کے ایڈیٹر بھی مقرر ہوئے۔ آپ کا "ہمایوں"، "بیسویں صدی"، "ادب لطیف"، "نگارش"، "شاہکار"، "عزائم"، "لکھنؤ"، "نئی دنیا" (کامٹی) "ہمارا ادب" (سرینگر) وغیرہ اور مقامی اخبارات میں چھپتا رہا۔ ریڈیو اور دوردرشن کی وساطت سے بھی ان کا کلام منظرِ عام پر آتا رہتا ہے۔ آج کل آپ شعروشاعری کے ذوق کو تسکین پہنچانے کے ساتھ ساتھ آل انڈیا لٹریری کانفرنس کے ریاستی صدر بھی ہیں۔

اقبال نے اُنہیں انتہائی متاثر کیا ہے۔ اس کا عکس آپ کی ۱۹۵۹ء میں لکھی ہوئی نظم "تازیانہ" کے ان اشعار سے لگایا جاسکتا ہے:-

فلک پر رات تاروں میں ہوئیں سرگوشیاں جیسی
زمیں پر آدمِ خاکی کی تقدیریں بدلتی ہیں
گماں تھا اُس کی قسمت پر ہمیشہ ہم مسلّط تھے
ہمیں محکوم کرنے کی تمنّائیں مچلتی ہیں
گوارا کی نہ تھی ابلیس نے جس کی جبیں سائی
زمین و آسماں کی رفعتیں قدموں میں پلتی ہیں

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی شاعری پر پانچویں دہائی کے اواخر تک پنجاب کے حلقۂ شعراء خاص طور پر حفیظ جالندھری، جوش اور ماہر القادری کی ہلکی پھلکی نظموں کا گہرا اثر رہا۔ چنانچہ اس دوران جو نظمیں لکھی ہیں ان میں رواں بحر اور لفظی ترنم پر زیادہ زور ملتا ہے۔ اسی زمانے کی لکھی ہوئی نظم کے چند اشعار:-

پھر اُبھرتے جارہے ہیں ذہن میں تیرے نقوش
تھامتا ہوں تیری دھن میں آج پھر جام وسبو

اِک خلش بے نام سی ہے، اک تمنا لازوال
ہائے کتنا دل نشیں ہے امتزاج رنگ و بو
آج کیوں انسانیت تذلیل سے دوچار ہے
جس کی تقدیس و تفخر تھے ہمیشہ ارجمند
اِک سکونِ قلب کی دُھن کیوں ہراساں ہی رہے
پھینکتی ہے آج پھر یہ چاند تاروں پر کمند
آدم و حوا کی بیٹی آج کیوں مایوس ہے
روئے گیتی پر نمایاں جیسے ہو مکروہ داغ

بشارت سلیم کی غزل اگرچہ روایتی نہیں ہے، مگر اس میں رومانی فضا اور کلاسیکی آہنگ ضرور ملتا ہے، کہیں کہیں رومانی فضا میں بھی نئے اندازِ فکر اور اسالیب کے اثرات ملتے ہیں۔ وہ غزل کو مخصوص ترقی پسند تصورات سے بھی بچاتے ہیں ۔

ایک غزل کے چند اشعار :-

عجیب دستورِ گلستاں ہے کہ اس طرح سے بہار آئے
کسی کے حصّے میں پھول آئے، کسی کے حصّے میں خار آئے

نہ جانے خود کو کہاں پہ ہم نے کیا ہے گم اب یہ کس سے پوچھیں
اُنہیں تو شہروں میں دشت و صحرا میں ہر طرف ہم پکار آئے

تمہارے وعدوں کی دلکشی میں، تمہاری یادوں کی روشنی میں
وہ رات جو انتظار کی تھی وہ رات بھی ہم گزار آئے

(یہ غزل شاعر نے عرشؔ ملسیانی کی صدارت میں منعقدہ ایک مشاعرہ میں سنائی تھی)۔

غزل میں کلاسیکی روایت پسندی اور رومانی شاعری کا سنگم :-

تمہارے اندازِ دلربائی نے لاج رکھ دی صنم کدہ کی
یہی وہ اندازِ دلبری ہے صنم جو کعبے میں بھی سجادے

جو تیری محفل میں تشنہ آیا وہ مست اُٹھا، خراب اٹھا
جو تیری محفل سے مست اُٹھے کہاں وہ جائے تو ہی بتا دے
مجھ ہی سے آباد میکدہ ہے، مرے خدا مجھ کو یاد رکھنا
لٹا رہا ہوں میں زندگی کو، تو اپنی رحمت کو بھی لٹا دے

(یہ غزل شاعر نے مرحوم سجاد ظہیر کی صدارت میں منعقدہ ایک مشاعرے میں سنائی تھی)۔

— :: —

تنہا انصاری

آپ کا پورا نام حسین علی انصاری تھا۔ آپ کے والد ریاست کے سربرآوردہ اساتذہ میں شمار ہوتے تھے اور وہ فارسی و عربی کے جید عالم تھے۔ تنہا کو شعر و شاعری سے لگاؤ تھا۔ اُن کے شوق کو دیکھ کر ان کے والد نے اُن کی رہنمائی کی۔ تنہا نے کشمیر میں بی اے۔ اور بی۔ ایڈ کے امتحانات امتیاز کے ساتھ کامیاب کئے اور اپنے والد کی طرح محکمہ تعلیم میں بحیثیت مدرس داخل ہوئے۔ ماحول شعر و سخن کا تھا، اس لئے جلد ہی شاعر ہو گئے۔ ابتدا میں مروجہ روایت کے مطابق غزل گو بن گئے۔ پھر نظموں کی طرف راغب ہوتے اور پھر وسیع اصناف میں مختلف گوناگوں موضوعات پر طبع آزمائی کی۔ غزل اور نظم میں انھیں اونچا مقام حاصل تھا۔ کلاسیکی انداز میں مرثیہ لکھنے والے ریاستِ جموں و کشمیر کے واحد سربلند شاعر مانے جاتے ہیں۔ اقبال کے شیدائی تھے، اس لئے اُن کی نظموں میں عموماً اقبال کا اسٹائل نظر آتا ہے۔ تنہا کی فکر کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں اپنے عہد کی ساری تحریکیں سمٹ آتی ہیں۔ جدید ادبی رجحان کے زیرِ اثر بہت سی غزلیں تنہا نے ایسی بھی لکھی ہیں، جن میں فکر کا پورا تسلسل نہیں، آہنگ کا تسلسل ملتا ہے، نظموں میں مناظرِ فطرت، سماجی و سیاسی مسائل، مذہبی خیالات اور مسائل کو بھی جگہ دی ہے۔

ترتیب اور تجربوں کے اثرات بھی ملتے ہیں۔

غزل کے چند اشعار پیش ہیں ؎

سمجھ کر بادۂ گلرنگ پی لیتا ہوں خونِ دل
زباں خاموش، زخموں سے جگر گلپوش ہے ساقی

تھے وہ بھی دن کہ اپنے دل میں ہنگامے مچلتے تھے
ہوئی مدت کہ یہ کمبخت بھی خاموش ہے ساقی

وہاں خُم اور یہاں قطرے، ترا انصاف بھی دیکھا
یہ پامالِ ستم تنہا تو دریا نوش ہے ساقی

ایک اور غزل کے چند اشعار :- (جو فکر اور اسلوب کے لحاظ سے قابل قدر ہیں)۔

خُدا کے حوالے سدھارو، سدھارو
مری آرزوؤں کی رنگیں بہارو

نہ گھیرو، تصور پہ شب خوں نہ مارو
مچلتے ہوئے آنچلوں کے کنارو

حماقت ہے اب ذکرِ رُخسار و گیسو
طلسمِ محبت کے پرور دگارو

تلاشِ نظر، اک فریبِ نظر ہے
نظر کی نوازش کے امیدوارو

نظم میں منظر نگاری، ذاتی مشاہدات اور اندازِ بیان کی انفرادیت کے ساتھ :-

اُف وہ تابندہ جبیں لمحے، نظر افروز رات
وہ سکوں پرور زماں وہ تغیر بے ثبات
جیسے زد پر حُسن کی آکر رُکی تھی کائنات
ہائے وہ اعجازِ منظر، نغمہ بن جاتی تھی بات

⁂

میکدہ بردوش وہ معصوم سیلِ رنگ و بو
دفعتاً چھلکا دیا تھا جس نے جامِ آرزو

⁂

پھر کہیں سے آج بوئے زلفِ یار آئی ہے دوست
بہکی بہکی سی ہوا دیوانہ وار آئی ہے دوست

دعوتِ دیوانگی لے کر بہار آئی ہے دوست
پھر مری دُنیا میں دُنیائے شرار آئی ہے دوست
ایسا کچھ محسوس ہوتا ہے بہار آئی ہے دوست

اقبال کا اندازِ فکر اور جوش کا آہنگ لئے مرثیہ :-

کمر بستہ ہیں، سرگرمِ عمل ابلیس کے چیلے
جہاں میں نقشِ یزداں قلبِ انساں سے مٹانے کو
نظامِ اہرمن چالاک ہے صورت بدلنے میں
تپاں ہے روحِ چنگیزی یہاں قالب میں آنے کو
کہو شبیرؑ سے میداں میں پھر للکار تا نکلے!
یزیدِ عصر ہے تیار خنجر آزمانے کو
یزیدیت، قبا جمہوریت کی زیبِ تن کر کے
اُٹھی ناز و ادا سے پھر نیا اک گل کھلانے کو

تنہاؔ بارہ مولہ کے قصبہ دلنہ میں سنہ ۱۹۲۰ء میں تولد ہوئے۔ اور ان کی وفات سنہ ء میں ہوئی۔

— :.: —

اکبرؔ جے پوری

آپ جے پور میں سنہ ۱۹۲۶ء میں پیدا ہوئے۔ اسلاف کشمیر تھے، جو بسلسلۂ ملازمت جے پور میں مقیم تھے، وہیں اکبرؔ نے تعلیم پائی۔ شعر و سخن سے لگاؤ پیدا ہوا۔ اور سید معشوق حسین اطہر سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔ تقریباً تیس ۳۰ سالوں سے شعر و ادب میں طالع آزمائی کر رہے ہیں۔ بسیار گو ہیں اور شاعری کے رموز و نکات سے واقف ہیں۔ غزل اچھی کہتے ہیں، اپنے زمانے کے واقعات پر کئی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ سنہ ۱۹۴۰ء سے سرزمینِ کشمیر کے شعر و ادب کی آبیاری کر رہے ہیں، لکھنوی

انداز میں غزل کہنا اُن کا انفرادی چلن ہے۔ پھر بھی عصری تحریکوں کا رنگ و آہنگ اُن کے یہاں کہیں نہ کہیں نمایاں ہو ہی جاتا ہے :-

ہنسی گلوں کی خزاں کو قریب لائی ہے ۔۔۔ سلیقہ چاہئے اے دوست مسکرانے کا

⁂

ہر شام کے پردے میں ہوتی ہے سحر پنہاں ۔۔۔ مرنا بھی حقیقت میں جینے کا بہانہ ہے

⁂

ہر طرف پھیلا ہوا ہے حُسن کا دام فریب ۔۔۔ پاؤں اس وادی میں رکھنا دیکھ اے دل دیکھ کر

نظم "جنّتِ کاشمر کی ایک جھلک" :-

رد کشِ انہارِ فردوس البتارِ کاشمر ۔۔۔ نازشِ گلزارِ جنّت لالہ زارِ کاشمر
نخلِ طوبیٰ پرت از شاخِ چنارِ کاشمر ۔۔۔ فرعِ سدرہ شرمگیں از برگ و بارِ کاشمر
سرنگوں نہ آسماں از گلستانِ کاشمر ۔۔۔ خوضِ کوثر آب آب از رود بارِ کاشمر

⁂

اکبر نے مرثیہ کے انداز میں بہت اچھی نظمیں بھی کہی ہیں ۔ ان کا کلام ۶۵ سنہ میں "سازِ شکستہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

— ⁂ —

عبد الرحمن راہی

راہی سنہ ۱۹۲۵ء میں سرینگر کے ایک متوسط خاندان میں پیدا ہوئے۔ سرینگر میں ہی فارسی اور انگریزی میں ایم۔ اے کیا۔ روزنامہ "خدمت" کی ادارت میں شامل ہوئے۔ نوجوانی ہی سے شعر و شاعری محبوب مشغلہ رہا۔ اور یونیورسٹی تک آتے آتے یہ مشغلہ کافی تنومند ہو گیا۔ اپنی ذہانت سے وہ کشمیری کے بالخصوص اور اُردو کے بالعموم سر دلعزیز شاعر ہو گئے۔ حال ہی میں یونیورسٹی آف کشمیر کے شعبۂ کشمیری کے

ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ راہی بیک وقت شاعر، ادیب بھی ہیں اور نقّاد بھی۔ تینوں شعبوں میں ان کا کام اتنا ہے کہ اس مقالے میں طوالت کے خوف سے اُس کا ذکر کرنا ممکن نہیں۔ ہم اُن صرف اُن کی اُردو شاعری پر ہی اکتفا کریں گے۔ راہی ترقی پسند تحریک کے ساتھ اُبھرے اور جدیدیت سے بھی متاثر ہوئے۔ اُن کی شاعری میں کلاسیکی شان، ترقی پسندی کی "حقیقت" اور جدیدیت کی دروں بینی نظر آتی ہے۔ راہی اپنی فکری خصوصیات اور نئے شعری تصورات کے سبب ایک امتیازی مقام حاصل کر چکے ہیں۔

اُن کی غزل میں روایت پسندی بھی ہے اور جدید انداز بھی پایا جاتا ہے۔ وہ غزل کو مخصوص ترقی پسند تصورات کے اظہار سے برتتے ہیں۔ انھوں نے اعلیٰ پایہ کی نظمیں بھی لکھی ہیں۔

راہی کا اصلی سرمایہ اُن کی نظمیں ہی ہیں ؎

یاد پھر اُس شعلہ رُو کی آگئی — آگئی اور آگ سی بھڑکا گئی
وہ لچک کر رہ گئی قوسِ قزح — یا کوئی نازک کمر بل کھا گئی

⁘

نقیب تو نے نئے دن کا صور پھونک دیا — اندھیرا ٹوٹ چکا سونے والوں کو تو جگاؤ

⁘

نہ بجھ سکے گا کبھی آندھیوں سے اب یہ چراغ — حیات نے نئی منزل کا پا لیا ہے سراغ
فسانہائے غمِ دہر طول کھینچ گئے ! — ہنسی حیات کی چھلکا رہی ہے اپنے حلاغ

⁘

کیا تمدن کی حفاظت کے یہی معنی ہیں — علم و آگاہی کے دروازے مقفل ہو جائیں
جیب میں سکوں کی جھنکار نہ ہونے کے سبب — آج اُٹھتے ہوئے انساں کے ارادے سو جائیں

— ⁘ —

قاضی غلام محمد

ولادت سنہ ۱۹۳۶ء میں اسلام آباد (کشمیر) میں ہوئی۔ اُن کے والد قاضی محمد حسین علم و ادب کے شائق تھے۔ وراثتاً قاضی غلام محمد بھی علم و ادب کے مالک ہو گئے۔ علی گڑھ سے ایم اے ریاضی میں امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ سنہ ۵۸ء میں جموں و کشمیر یونیورسٹی میں شعبۂ ریاضیات میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ کئی سال پہلے انہیں ریڈر کے عہدے پر ترقی ملی۔ قاضی صاحب ریاست کے مستند اور قابل ریاضی داں مانے جاتے ہیں۔

شعر و سخن سے ابتدائی عمر ہی سے لگاؤ تھا اپنی ذہانت سے اس میں چار چاند لگا دیئے۔ نئی معنویت کو تلاش کرنا، مزاح اور طنز سے صحیح کام لینا، پیروڈی جیسے مشکل فن کو نبھانا، سنجیدہ تصورات کو مضحکہ خیز مرتبہ پر لانا، سنجیدہ چہرے سے نقاب ہٹا کر خندہ ریزی کے مواقع پیدا کرنا، سماجی مسائل کو اُبھارنا اور زبان و بیان پر مکمل قدرت رکھنا قاضی کی ذہانت کی نمایاں خصوصیتیں ہیں۔ قاضی صاحب غالب کو بے انتہا چاہتے ہیں، اسی لئے وہ غالب کی شاعری میں نئی معنویت تلاش کرتے ہیں۔

آیئے! اُن کی شاعری کو ایک جھروکے سے دیکھیں :-

یہ ہے ماتم میں نہیں اپنی رقم کے غم میں
شہر کا بنیا سیہ پوش ہوا میرے بعد

اختر شیرانی کی نظم کا بگڑا روپ :-

کیا اب بھی وہاں کا ہر گنجا اسکالر سمجھا جاتا ہے!
کیا اب بھی وہاں کا ہر ایم۔ اے غالب پر کچھ فرماتا ہے!

اور جہل کی ظلمت میں کھو کر اقبال سے بھی سے ٹکراتا ہے

قطعہ :-

قبائے زریں ملبوس منکر میسّر نعمتیں ہیں اس کو کیا کیا
بدن اپنا ہے ننگا، پیٹ خالی ہم اس کے ہیں "ہمارا پوچھنا کیا"

⁂

ڈر یہ نہیں کہ ہجر میں جینا محال ہے ڈر یہ ہے خاکسار کثیر العیال ہے
جاؤں میں غم نصیب کہاں اور کہاں نہیں
وہ کونسی جگہ ہے جہاں "تیری ماں نہیں"

اُن کا مجموعۂ کلام "حرفِ شیریں" کے نام سے سنہ ۱۹۶۲ء میں ڈاکٹر زور نے شائع کیا ہے۔

فاروق نازکیؔ

آپ میر غلام رسول نازکیؔ کے فرزندِ ارجمند ہیں۔ سری نگر میں ولادت ہوئی اور اسی شہر کے شور و غل میں تعلیم مکمل کی۔ یہاں کی یونیورسٹی سے اُردو میں ایم اے امتیاز کے ساتھ کامیاب کیا۔ ریڈیو کشمیر میں ملازم ہوئے۔ بعد میں دوردرشن میں پروڈیوسر ہو گئے۔ آج کل دہلی میں تعینات ہیں۔

شعر و ادب کا ذوق اپنے گھر کے ماحول سے پیدا ہوا۔ رفتہ رفتہ اچھے شاعروں میں شمار ہونے لگے۔ بنیادی شوق نے ماحول سے شہ پاکر انہیں کہنہ مشق بنا دیا۔ جدید انداز کے شاعروں میں اُن کا ایک منفرد مقام ہے۔ روایتی غزل سے زیادہ نظم کی طرف راغب ہوتے۔ اِن کی نظم کلاسیکی انداز اور جدید آہنگ لئے ہوئے نظر آتی ہے۔ اُن کی فکر کا موضوع عام طور پر حالات کے مسائل ہیں۔ جدید انداز میں نظم کہتے ہیں اور علامتوں کے اظہار پر قدرت رکھتے ہیں۔ "تثلیث" اور "ایک احساس" وغیرہ اُن کی بہت اچھی نظمیں ہیں۔ اُن کی غزلوں میں ہمارے اپنے عہد کے پیدا کردہ اسلوب، موضوعات اور رویّے ملتے ہیں۔

ملاحظہ ہوں ان کی شاعری کے کئی رنگ :-

(نئی نظم کا سفر)

گماں کے شہر میں، اوہام کے مکانوں سے
نکل پڑے تھے کئی کارواں یقینوں کے
جمالِ صبح میں تھا قتلِ ماہتاب کا رنگ
فلک کی مانگ میں کچھ داغ تھے جبینوں کے
نظر نظر سے ٹپکتا تھا زہر کا الماس!
دلوں پہ پلتے تھے جب سانپ آستینوں کے
ہمیں نے اپنا مقدر لکھا تھا پانی پر
ہمیں نے آگ لگائی تھی خود سفینوں میں
یہ اُن دنوں کی کہانی ہے جن دنوں ہم تم
چھپائے پھرتے تھے اک دوسرے کو سینوں میں
ازل کو ریت پر لکھی گئی تھیں تقدیریں
فنا کے شہر میں آئے تو جاوداں ٹھہرے
وہ جب بھی اُترے ہیں اونچائیوں سے اُترے ہیں
جو قربِ ذات کی لذت کے رازداں ٹھہرے

(غزل میں کلاسیکی انداز)

مہ وشانِ چمن کی بات کرو — زیست کے بانکپن کی بات کرو
آج تلخی بہت زیادہ ہے — جامِ توبہ شکن کی بات کرو
گلعذاروں سے پیار کرنے دو — نرگس و نسترن کی بات کرو
بُت کدوں کے چراغ جاگ اٹھیں — اُس بتِ سیم تن کی بات کرو

:.

میں کہ ہوں امن کے گلشن کا شفق رنگ گلاب
میرے ہونٹوں پہ ہے شبنم کی ملائم تحریر
میرے اوراق پہ مرقوم ہے اُلفت کی کتھا
قصّۂ ذوقِ نظر
قصّۂ نغمۂ وصل
اور ملاقات کی شاموں کے سُہانے قصّے
آتشِ لالہ و گُل مجھ سے جِلا پاتی ہے
چشمِ نرگس کو دیا میرے ہی جلوؤں نے خمار
میں ہوں پیغمبرِ گُل اور بہاروں کا رسُول!

— ⁘ —

محمد امین کامل

آپ سنہ ۱۹۲۴ء میں کشمیر کے ایک قصبہ پرنا میں پیدا ہوئے تعلیم بی۔اے ایل
ایل۔بی تک پائی۔ کلچرل اکیڈمی کے ایک بڑے عہدے تک ترقی کر کے ریٹائر ہوئے
کامل صاحب ادبی حلقوں میں امین کامل کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ کشمیر کے
ممتاز شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ امین کامل کے پہلے استاد طالب تھے۔
اُن ہی کی نگرانی میں اُن کی شاعری پروان چڑھی۔ رفتہ رفتہ ریاضت سخن سے
اُستادوں میں شامل ہوئے۔ زمانۂ طالب علمی میں غریق تخلص کرتے تھے، بعد
میں کامل تخلص اختیار کیا۔ غزل میں اتنی مہارت حاصل کی کہ باہر کے مشہور
رسائل میں ان کی غزلیں شائع ہوئیں۔ ۱۹۴۰ء تک اتنا کلام جمع کیا کہ ایک شعری

مجموعہ ہو گیا۔ مگر نامساعد حالات کی وجہ سے وہ چھپ نہ سکا۔

عام طور پر شاعروں کی طرح کامل نے بھی اپنی شاعری کی شروعات غزل سے کی۔ لیکن ان کی غزل روایت پسندی سے باہر نہ جا سکی۔ ترقی پسندوں کا ساتھ ہوا تو نظم لکھنے کی طرف مائل ہوئے، نئی فکر اور نئے انداز کو اپنایا۔ ان کی نظموں میں جیتے جاگتے انسانوں کے دُکھ سُکھ کی کہانیاں، حقیقت کے پس منظر کیساتھ نظر آتی ہیں۔ حقائق سے وابستگی اور نئی روش سے وابستہ اُن کی نظموں کا خاص طور پر حاصل کلام ہے۔ وہ زندگی کے تذبذب سے آنکھیں نہیں چراتے۔! حقیقت سے آنکھیں ملانا کامل صاحب کی ایک خاص ادا ہے۔ غرض زندگی کے گوناگوں مسائل کامل صاحب کی تخلیق شعر کے لئے مستحن و محرک ثابت ہوئے ہیں۔

پُرانی شاعری اور نئی شاعری کے دوراہے پر یوں کامل صاحب تذبذب کے عالم میں کھڑے ہیں ؎

اک کٹھن منزل سی ہے پیش نظر	اور بلا کی کش مکش ہے کیا کروں
ایک جانب ہے نئی طرزِ روش	اِک طرف کہنہ روش ہے کیا کروں

(ان کی نظم "خلش" سے)

یُوں تو کامل ترقی پسندوں میں شامل تھے، مگر روایتی غزل سے کبھی ناطہ نہ توڑا۔ ہاں یہ ظاہر ہے کہ غزل میں بالآخر اُنھیں نئے اثرات کو لانا ہی پڑا۔ نظم میں وہ خالص ترقی پسند لگتے ہیں، جب کہ غزل میں کہیں کہیں کلاسیکیت کے عاشق بھی دکھائی دیتے ہیں۔

نظم میں ترنم اور فکر کی تندہی ملاحظہ ہو ؎

جو آگ لگائیں کھیتوں میں	مُنہ بند کریں برساتوں کا
اِس امن کی پیاسی دھرتی پر	کیا کام ہے ان بدذاتوں کا
کیا اُن کی سُہانی صبحوں کے	نورانی نظارے ڈستے ہیں

نظم میں اقبال کا آہنگ :-

گرد میں لوحاد ثو! اے آندھیو! آ! سہم چلو
بجلیو! برساؤ آتش، پھوٹ پڑ، اے زلزلو

رومانی لمحات کے نظارے :-

مہکتی زلفیں بپا آسکی، چمکتا ماتھا ہے
کہ روحِ صبحِ چمن ہے، روان شام ہے وہ

تری نظر کا تبسم، تری جبیں کی جھلک
اُمید بن کے نکھرتی ہے میری آہوں میں

— ⁘ —

میرزا کمال الدین شیدا

آپ کی ولادت سنہ ۱۹۰۰ء میں سرینگر میں ہوئی۔ ان کے والد میر اجلال الدین میرزا کشمیر کے جید عالم اور اچھے شاعر تھے۔ جن کی کچھ غزلیں اور مثنوی "حسن و گوہر" میں موجود ہیں۔ میرزا کمال الدین کے ادبی ذوق کی نشو و نما میں ان کے والد کا نمایاں ہاتھ نظر آتا ہے۔ میرزا نے سنہ ۱۹۲۹ء میں بی اے پاس کیا۔ حکومت نے انہیں بلدیات میں تربیت کے لئے ہندوستان کے کئی شہروں میں بھیجا۔ جہاں سے وہ تربیت حاصل کرکے سری نگر کے وارڈ آفیسر مقرر ہوئے۔ اور ترقی کرکے ڈائریکٹر لوکل باڈیز ہوگئے۔ سنہ ۵۸ء میں حکومت نے ان کے علمی و ادبی ذوق کے مدِنظر کلچرل اکادمی کا معتمد منتخب کیا۔ اور آج کل اوقاف اسلامیہ میں اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

شیدا کا تخلیقی سفر بہت پُرانا ہے۔ روایتی، ترقی پسند اور کلاسیکی اسالیب

تینوں کو انھوں نے پرکھا اور برتا ہے۔ وہ غزل میں تغزل سے زیادہ اخلاقی پہلو پیش کرتے ہیں۔ نظم میں کہیں کہیں وہ "دروں بینی" پر مائل ہو جاتے ہیں۔ شیدا نے مناظرِ قدرت اور خاص طور پر کشمیر کے مناظر پر حفیظ جالندھری کے انداز میں نظمیں لکھی ہیں۔

ذیل میں ہم اُن کی شاعری کے کئی رنگ پیش کرتے ہیں:۔

ابرِ رحمت اب بھی آفاق گیر
آدمِ خاکی ہوس میں ہے اسیر

شیخ حمزہؒ سے عقیدت کا اظہار:۔

اے ذکی! مجھ کو گلہ ہے یار سے | تجھ کو شکوہ چرخِ ناہنجار ہے
عشق کو صورت گرِ عالم کریں | کیوں جہانِ کاف و نوں برہم کریں

⁂

تیری فطرت سے ناداں فتنہ سامانی نہیں جاتی
نہیں جاتی، نگہہ کی تنگ دامانی نہیں جاتی
سمٹ سکتا نہیں بکھرا ہوا ملّت کا شیرازہ
کہ جب تک نوجوانوں کی تن آسانی نہیں جاتی
بدل کر روپ جمہوری وہی دورِ شہنشاہی
مری محکوم دُنیا سے جہانبانی نہیں جاتی

⁂

شیدا کا کلام ابھی تک مجموعے کی صورت میں شائع نہیں ہوا ہے۔

— ⁂ —

مرغوب بانہالی

آپ ۱۹۳۷ء میں بانہال کے موضع بنکوٹ میں پیدا ہوئے۔ میٹرک پاس کیا۔ معلم ہوئے۔ فارسی اور اردو میں ایم اے کیا۔ کشمیر یونیورسٹی میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ اور آج کل کشمیر کے شعبہ "سینٹرل ایشین اسٹڈیز" میں کام کر رہے ہیں۔ مرغوب اُردو اور کشمیری کے ایک اچھے شاعر ہیں، اُردو غزل پر خاصی قدرت رکھتے ہیں۔ شاعری کے علاوہ مرغوب ایک سلجھے ہوئے تاریخ داں بھی ہیں۔ ان کی ناقدانہ نظر عمیق اور گہری ہے۔ وہ ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ زیر نظر مقالے میں اُن کے تمام اوصاف کو زیرِ بحث لانا ممکن نہیں۔

سرِ دست اُن کے کچھ شعر سنیئے:-

کب تک وفا کے زمزمے گائے کسی کا دل
کب تک جفا کا درد چھپائے کسی کا دل

تابانیٔ خرد سے سکوں ہے گریز پا!
ڈھونڈ رہے ہے پھر جنوں کے سائے کسی کا دل

ایک غزل جو مسلسل لگتی ہے ؎

پھیلا ہوا ہے چار سو جلوہ بہار کا
ہے یہ شفق بھی عکس کسی لالہ زار کا

مشکل ہے کھلنے پائے مرا غنچۂ امید
ہمدم مجھے پیام نہ دے نو بہار کا

—:—

"کشمیر میں اُردو شاعری کے اس جائزے کے بعد وادی میں اُردو شاعری کے معیار اور رفتار کا قارئین کو اندازہ ہو گیا ہوگا —— لیکن دل چاہتا ہے کہ کشمیر کے اُن چند نوجوان شعرا کا بھی ذکر کیا جائے، جو بڑی تیزی سے اُردو شاعری میں اپنی حیثیت منوا رہے ہیں۔

ایسے شاعروں میں خالد بشیر، فاروق آفاق شافی شفائی، رفیق ہمراز، نذیر احمد نظیر، یوسف سلیم، ہمدم کشمیری، قیوم کشمیری، فرید پربتی، رفیق راز، رخسانہ جبیں، مسعود سامون، سلطان الحق شہیدی وغیرہ اردو کے بلند ایوانوں تک رسائی حاصل کرنے کی جدوجہد میں رواں دواں ہیں ——!"

سلطان الحق شہیدی اُن کی ولادت سرینگر میں سنہ ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔ یہیں پلے بڑھے اور جوان ہوئے۔ ادیب فاضل کامیاب کیا اور مدرس ہو گئے۔ گذشتہ ۲۰ برسوں سے ادبی میدان میں ہیں۔ نظم اور غزل کے شاعر ہیں۔ ان کے اشعار میں کلاسیکی مزاج بھی ملتا ہے اور جدیدیت کی بو باس بھی۔ وہ غزل سے زیادہ نظم سے پیار کرتے ہیں۔ ان کا کلام ملک کے مقتدر رسائل میں چھپتا ہے۔ فکرِ نو کا اثر اُن کی نظموں میں نمایاں نظر آتا ہے۔

غزل کے چند اشعار :-

کشتیٔ شوق کو موجوں کے حوالے کر دو | بحرِ ہستی میں اُمڈ آئے جو طوفان کوئی
حاصلِ عمرِ گراں مایہ سمجھ لو اس کو | بزمِ احباب میں مل جائے جو انسان کوئی
اب بھی انسان ہے، انسان کے ہاتھوں مجبور | گرچہ مغفور نہ کسریٰ ہے نہ خاقان کوئی

⁂

عظمت کُفر سے ہے قائم دین! | کعبہ کیا گر نہ ہوں یہ بُت خانے
ہائے رندوں کی بد مذاقی ہے | ٹوٹتے جا رہے ہیں پیمانے
جس کا مرہم نہیں ہے تو بھی دوست! | گھاؤ ایسے دئے ہیں دُنیا نے

آزاد نظم کا نمونہ :-

بے کراں آسماں
چاند سورج لئے
ظلمتوں سے مسلسل نبرد آزما
تھے، اور یہ زمین کوہِ آتش فشاں سی تھی پھر۔
کُچھ سکوں سا مِلا اس کشاکش کو جب
سرد ہونے لگے آتش نشاں
گھاس اُگلنے لگی اور زرخیزیاں
زلیست کو اپنی جانب بُلانے لگی
چند کیڑے پلے، چند حیوان بڑھے اور تکمیل انسان کی صورت ہوئی۔

— ⁘ —

مسعودؔ ساموں

مسعود ساموں کو میں نے پہلی بار ایگریکلچرل یونیورسٹی میں ڈپٹی رجسٹرار کے روپ میں دیکھا۔ پہلی ہی نظر میں وہ مجھے دور بین اور شہرت سے دور بھاگنے والے اور زود فہم ذہانت کے مالک لگے۔ دلکش خدو خال، کھلتا ہوا پہاڑی رنگ، قد و قامت سڈول، مگر نحیف انداز لئے ہوئے۔ آنکھوں پر سفید کمانی دار عینک، عینک کے پیچھے دو چھوٹی چھوٹی دوررس چمکتی آنکھیں، ذہانت کا زندہ جاوید ثبوت۔ متوازن پیشانی، ستواں ناک۔ چہرے پر بے ترتیب داڑھی، پتلے پتلے ہونٹ، سر پر چھوٹے سیاہ بال۔ لہجہ انکسار و خلوص سے بھرا ہوا۔ شرافت و وضعداری کی تصویر۔ یہ ہے ساموں کا پورا حلیہ!

آپ کشمیر کی اس گلپوش وادی میں ایک دور دراز پہاڑی علاقے گریس میں ۲۸ فروری ۱۹۵۲ء میں پیدا ہوئے۔ اُن کی جائے پیدائش سری نگر سے دو دن کی مسافت پر واقع ہے۔ یہ پہاڑی علاقہ سردیوں میں تمام دنیا سے کٹ جاتا ہے۔ انتہائی دشوار گذار پہاڑی راستوں کی وجہ سے اس سارے علاقے کو کشمیر کا "پس ماندہ" علاقہ کہا جاتا ہے۔ دشوار اور کٹھن راستوں کی وجہ سے یہاں آمد و رفت بہت ہی کم ہے۔ اسی وجہ سے یہ علاقہ پچھڑے پن کا شکار ہے۔ یہیں پر ہمارا یہ شاعر پلا اور جنگلی ہرن کی طرح اٹکھیلیاں کرتا ہوا جوان ہوا۔ ان کے والد کا نام محمد انور ساموں ہے، وہ ایک بڑے گھر کے چشم و چراغ ہیں، خود بھی ایک بڑی فیملی کو چلا رہے ہیں۔ ہمارے شاعر کے علاوہ وہ سات بیٹوں اور تین بیٹیوں کے فرائض سنبھالے ہوئے ہیں۔ وہ اسکول ماسٹر رہ چکے ہیں، انھوں نے اپنے بچوں کو شروع سے ہی علمی ماحول میں رکھا۔ مسعود صاحب نے گریس میں ہی میٹرک کیا۔

کشمیر یونیورسٹی سے پہلے ایم اے فارسی اور پھر ایم اے اردو کیا۔ تعلیم سے فارغ ہونے پر ٹیچری کی۔ لیکن ٹیچری راس نہ آئی۔ پھر ایڈمنسٹریٹو سروس میں آئے اور ڈپٹی سکریٹری کے عہدۂ جلیلہ تک پہنچے۔ وہاں سے ڈپوٹیشن پر اگری کلچرل یونیورسٹی میں آئے۔ آج

کل وہیں پر ڈپٹی رجسٹرار ہیں۔ ایک ملاقات میں، میں نے ان سے پوچھا "آپ کی ادبی زندگی کا آغاز کب ہوا۔؟" "۱۹۷۰ء میں۔" انھوں نے جواب دیا۔

س:۔ "آپ شروع میں کن شاعروں سے متاثر رہے۔؟"

ج:۔ "ابتدا میں غالب، میر، اقبال، خیام، حافظ اور بیدل سے متاثر رہا۔ بعد میں تغیرات آئے اور میری پسند بھی تجربے کی کسوٹی پر پرکھ کر بدلتی رہی۔ ویسے میں سب سے زیادہ متاثر اقبال سے ہوا۔ مگر تجربے کی بالغانہ نظر نے مجھے غالب کا گرویدہ بنایا۔"

س:۔ جس وقت آپ نے شاعری شروع کی۔ اس وقت کشمیر میں اور کشمیر سے باہر اردو شاعری کا کیا حال تھا۔؟"

ج:۔ آج سے بہتر تھا۔ Regional زبانوں کے عروج سے اب اردو کی چمک ماند پڑ گئی ہے۔ پھر بھی قابلِ تردد نہیں ہے۔!"

س:۔ "آپ کے خیال میں کشمیر میں اردو شاعری کب شروع ہوئی۔؟"

ج:۔ "میرے خیال میں کشمیر میں اردو شاعری باضابطہ طور پر آزادی کے بعد ہی شروع ہوئی۔ اس سے پہلے یہ نہ ہونے برابر تھی[1] ۱۹۴۷ء سے اردو شاعری کے عالم میں ایک انقلاب آیا۔ اور اس انقلاب کے اثرات کشمیر پر بھی پڑے۔ جس کی وجہ سے یہاں بھی اردو شاعری زور و شور سے شروع ہوئی۔ کس نے اس کی ابتدا کی، یہ کہنا بڑا مشکل ہے۔"

س:۔ "اردو شاعری کے اہم رجحانات اور خاص طور پر ترقی پسندی اور جدیدیت کے رجحان کا آپ کی شاعری پر کیا اثر پڑا۔؟"

ج:۔ ترقی پسندی سے میں ہرگز ہرگز متاثر نہیں ہوا ہوں، اگر سچ کہا جائے تو میں جدیدیت کی پیداوار ہوں۔ ہاں ترقی پسندوں میں ایک آدمی ایسا ہے، جس سے میں کسی حد تک متاثر ہوا ہوں۔ اور وہ ہے فیض احمد فیض۔ صرف جہاں تک ان کی کلاسیکی

---

[1] یہ مسعود سامون کا صرف ذاتی خیال ہے۔

شاعری کا تعلق ہے، ورنہ اُن کی پروپیگنڈا شاعری میرے نزدیک شاعری ہی نہیں"۔

یہ تھے اُس ذہین شاعر کے خیالات جس نے پچھلی دو دہائیوں میں اپنی شاعرانہ عظمت کا ادبی حلقوں میں لوہا منوالیا ہے۔ ان کی شاعری شروع سے آخر تک، جدیدیت کی پیداوار بھی ہے اور علمبردار بھی۔ شاعری کے رموز واسرار، نکات و عروض سے وہ نہ صرف واقف ہیں، بلکہ اُن کو احسن طریقے سے برتنے کا ہُنر بھی جانتے ہیں۔ وہ علامات وابہام اور ابہام کو نہ صرف اپنی شاعری میں بڑی خوبی سے آزما رہے ہیں، بلکہ نئے نئے موضوعات کو لے کر اچھوتے پیکروں میں پیش کرنے میں بھی انتہائی چابکدستی سے کام لے رہے ہیں۔ نظم سے زیادہ غزل میں پختہ ہیں۔ اُن کی غزل ہر لحاظ سے پایاب ہے۔ مسعود صاحب نظم اور غزل کے ساتھ ساتھ رباعی بھی کہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو اُن کی ایک رُباعی:-

لکھ، لوحِ جبیں میری پشیماں لکھدے
ہاں صفحۂ ادراک پریشاں لکھدے
ہر بات بِنا پوچھے ہی لکھنے والے
نادیدہ قلم دیدۂ گریاں لکھدے

غزل کے چند اشعار:-

سخت مشکل مرحلوں کے درمیاں
یاد، یارِ مہرباں آنی بہت

پھر حدیں کیسی، کنارے کونسے
پاٹ کم چوڑا تھا طغیانی بہت

بادلوں کی دوستی میں اس برس
سوکھی آنکھوں کو ملا پانی بہت

ایک اور غزل کے اشعار

فرسودہ زینے گھر کے اُترنا ہے رات بھر
پیاسا سا ہی اس جزیرے میں مرنا ہے رات بھر

دن بھر اراد ے کس کے سمیٹے رہے مجھے!
پانی کے دائروں میں بکھرنا ہے رات بھر

الضاف ہو چکا ہے جبیں پر مری رقم
کچھ سانس گننے پھر بھی ٹھہرنا ہے رات بھر

وہ سو یا سنگ سنگ ارادوں کو اوڑھ کر
اور مجھ کو آنکھ آنکھ بکھرنا ہے رات بھر

— ⁂ —

عبد القیوم خاں ہمدم کاشمیری

آپ سری نگر کے ایک متوسط خاندان میں ۱۹۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم پاکر سرکاری آرٹس ایمپوریم میں ملازم ہو گئے۔ انھوں نے جوانمری سے ہی لکھنا شروع کیا۔ عمل پیہم اور یقیں محکم سے اُن کا کلام نکھرتا گیا اور آج اُن کی غزلیں اور نظمیں ملک کے معتبر رسالوں میں شائع ہوتی ہیں۔ وہ روایت پسند بھی ہیں اور نئے اسالیب کو اپنے کلام میں سمونے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ اُن کا کلام "تعمیر" اور "شیرازہ" (سری نگر)، "صبا" (حیدر آباد)، اور "نگارش" (امرتسر) میں اکثر شائع ہوتا رہتا ہے۔

اُن کی شاعری کے چند نمونے :-

چاندی راتیں ہوں یا برسات کے دن ہم نشیں
دل بہلتا ہی نہیں، لاکھوں جتن ہم نے کئے
میں نے اکثر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
زندگانی کو ہزاروں جاوداں لمحے دیئے

:.:

یہ فقط سوزِ تمنّا کا صلہ ہے اے دوست!
تیرگی میں بھی ہے روشن مرا کاشانۂ دل
لاکھ سمجھاتی رہی عقل، مگر اے ہمدم
آہ! اپنا نہ ہوا یہ کبھی بیگانۂ دل

— :.: —

رفیق راز

آپ سرینگر کے ایک محلہ براری پورہ میں پیدا ہوئے۔ پہلے فارسی میں شعر کہتے اور نثر لکھتے تھے، پھر اُردو کی طرف راغب ہوئے۔ راز صاحب جدید غزل گو ہیں۔ اُردو میں اُن کا کلام اکثر چھپتا رہتا ہے۔ اردو میں ہی انھوں نے ۱۹۷۶ء میں ایم۔ اے کیا۔ ۱۹۷۷ء میں انھوں نے نئی دہلی کے قومی مشاعرے میں بحیثیت کشمیری شاعر کے، کشمیری زبان کی نمائندگی کی۔ راز صاحب پہلے کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ کشمیری میں لیکچرار رہے، پھر ریڈیو کشمیر میں معاون پروڈیوسر مقرر ہوئے اور آج کل اپنی ملازمت کے ساتھ ساتھ وہیں پر اردو اور کشمیری شاعری کی زلفیں سنوارنے میں مصروف ہیں۔

راز کی شاعری تجربوں کا پیکر ہے، انھوں نے ہمیشہ زندگی اور فن کے سفر میں وجود کے تجربے کو رہنما بنایا ہے۔ اس تجربے سے جو کچھ پایا ہے۔ اس کو بے کم و کاست بیان کر دیا ہے۔ اس لئے اُن کی شاعری پر حسّی فضا چھائی ہوئی ہے اور ہر شعر پر ایک بے قرار روح کا غلبہ ہے:-

ایک غزل کے چند اشعار سہ

نہ چاند تارے لکھے تھے نہ آفتاب لکھا تھا\
سیاہ شہر کے ماتھے پر زیرِ آب لکھا تھا

وہ پیڑ اب بھی ہے وہیں کہ جس کی چھاؤں میں اکثر\
ترے بدن پر مرے لمس نے شباب لکھا تھا

خزاں رسیدہ ہر اک صفحۂ قرار پہ اک دن!\
سنہری یاد کے جھونکوں نے سبز خواب لکھا تھا

— ⁘ —

رُخسانہ جبین

آپ نے ۱۹۵۵ء میں خواجہ بازار (سرینگر) میں ولادت پائی۔ والد کا نام غلام نبی شاہ ہے اور وہ سرکاری ملازم ہیں۔ شاعری کی شروعات ۱۹۷۷ء میں کشمیر یونیورسٹی سے کی۔ ابتدا میں مخمور سعیدی، شہریار اور بلراج کومل سے متاثر رہیں۔ پھر تجربے نے انھیں جدید شاعروں کا گرویدہ بنا دیا۔ ۱۹۷۷ء سے ہی اُن کا کلام "شیرازہ" اور "تعمیر" (سرینگر)، "دھنک" (جموں)، "العطش" (جموں) "شب خون، عصری آگہی، جواز، تناظر، واردات، پیشرفت، مفاہیم، سطور اور ہندی "شیرازہ میں چھپتا رہا ہے۔ ریڈیو کشمیر میں بحیثیت PEX کام کر رہی ہیں۔ جدید غزل گو میں غزل کے فن اور اس کے اصلاحی لوازم کو انھوں نے بڑی محنت سے حاصل کیا ہے، اس لئے ان کی غزل میں فنی جھول نہیں پائے جاتے۔ ان کی غزل میں رمزیت بھی ہے اور قافیوں کی نیرنگی بھی۔ موضوعات اور اسلوب دونوں میں روایت پسندی بہت کم ہے۔ نمونہ کلام دیکھئے ؎

ذرا یہ سوچو کہ کیسا عجیب رشتہ ہے
سناں بدست تھا ہر شخص میرے چاروں طرف

تمہارا خواب دھواں ہے میرا خیال ہوا
بس اپنے سائے میں جائے اماں دکھائی دی

⁂

چُرا کے آنکھوں کی بینائی آفتاب دیا
یہ اُس نے اپنی طرف سے بڑی نوازش کی

جبینِ گل پہ وہ تصویر اُبھر نہیں پائی
تو لوحِ سنگ پہ اک منظرِ فنا ہی لکھ

کروں گی میں ہی چراغاں ترے جزیرے کو
مرے صدف کے مقدر میں تو سیاہی لکھ

⁂

وہ کورِ چشم، جسے قتل گاہ کہتے ہیں
مجھے پناہ گہِ جسم و جاں دکھائی دی

— ⁂ —

فرید پربتی

نوجوان شاعروں میں فرید پربتی بچپن سے شعر و شاعری کے دلدادہ رہے ہیں۔ سری نگر تاریخی محلّے سنگین دروازہ میں اُن کی ولادت ۸ اگست سنہ ۱۹۷۰ء میں ہوئی۔ حال ہی میں انہوں نے کامرس میں ایم۔اے کیا اور ملازمت میں غمِ روزگار کو دفن کر دیا۔ غزل گو ہیں، غزل کے علاوہ رُباعی بھی کہتے ہیں۔ ان کا کلام "نوائے صبح" (روزنامہ۔ سری نگر) اور ملک کے بہت سے جرائد و رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ فرید پربتی کا مزاج اگرچہ کلاسیکیت آمیز ہے۔ لیکن بعض اوقات جدید اسلوب کی پرچھائیاں اُن کے کلام میں حسّی گہرائی بھی پیدا کر دیتی ہے۔

نمونۂ کلام ملاحظہ کیجیے:۔

وہ رہ گزارِ تمنّا سے چوٹ کھا کے گیا — سکوتِ دشت میں اِک شور و غل مچا کے گیا

اُداسیوں کے پرندے منڈیر پر رکھ کر — خموشیوں کے شجر صحن میں سجا کے گیا

زمیں پہ چاند ستارے بکھیرنے والا — نجانے کیوں مرے گھر کا دِیا بجھا کے گیا

گزر کے ابر کی صورت میں بستیوں سے فرید — ہر اک نظر میں عجب تشنگی بسا کے گیا

⁘

بارشِ سنگ وادیوں پہ ہوئی
فصل پر قہرِ ناگہانی ہے

⁘

سرحد سے بھاگ آیا، سامانِ حرب چھوڑا
ہارا ہوا سپاہی سنیاس لے گیا ہے

⁘

کہاں سے ٹوٹ گیا ہوں مجھے یہ فکر نہیں — میں سوچتا ہوں کہاں سے گرا گئی ہے ہوا

⁘

کشمیر کے غیر کشمیری شعراء

عرصہ دراز سے کشمیر تہذیبی و ثقافتی اعتبار سے ہند و پاک کے دوسرے مراکز سے وابستہ رہا ہے۔ نہ صرف یہ کہ کشمیر کے شاعر و ادیب دلی، لکھنؤ، کراچی و لاہور اور دوسرے شہروں میں جا کر اپنے تخلیقی جوہر کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں اور اردو شعر و ادب کے سرمائے کو باعث افتخار بناتے رہے ہیں، بلکہ موقع بہ موقع اردو کے دوسرے مراکز سے تعلق رکھنے والے شاعروں اور ادیبوں نے بھی کسی نہ کسی عنوان سے وادی میں آکر شعر و ادب کی زلفیں سنوارنے کی کوششیں کی ہیں۔ ان میں سے بعض شاعر و ادیب ایسے ہیں جو کشمیر آئے اور پھر کشمیر کے ہی ہو کر رہ گئے اور کچھ ایسے ہیں جنہوں نے کشمیر میں ایک طویل عرصہ اس طرح گذارا کہ وہ کشمیر کے تہذیبی و ثقافتی ماحول کا ایک لازمی جزو بن گئے۔ چنانچہ کشمیر میں اردو شاعری کے تعلق سے ایسے غیر کشمیری شاعروں کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے، جنہوں نے کشمیر کو اپنا وطن بنا لیا۔ یا پھر اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ یہاں گزارا۔ ایسے لوگوں میں وامق جونپوری، آل احمد سرور، مظہر امام، جگن ناتھ آزاد، شہاب رضوی، کمال احمد صدیقی اور جمیلہ صدیقی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

جگن ناتھ آزاد

کشمیر کے مہمان شاعروں میں جگن ناتھ آزاد ایک ممتاز اور اعلیٰ درجہ رکھتے ہیں۔ وہ یہاں تقریباً ۵ سال سے بھی زیادہ مقیم رہے۔ آپ اُردو کے نامور ترین شاعر تلوک چند محروم کے فرزندِ ارجمند ہیں۔ آپ پیدائشی شاعر اور بسیار گو ہیں۔ اقبالؔ پر اُن کا کام بہت ہی انمول اور گرانقدر مانا جاتا ہے۔ کشمیر میں شعری محفلوں کے روحِ رواں رہے ہیں۔ نئے عہد کے مقبول ترین شاعر، متنوع فکری صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ملک اور ملک سے باہر کے مقتدر رسائل میں متواتر لکھتے رہتے ہیں۔ اُن کا شعری مجموعہ "ستاروں سے ذرّوں تک" ادبی حلقوں میں ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ اردو شاعری کی ہر صنف پر کامیاب اور پایاب طبع آزمائی کی ہے۔

نمونۂ کلام پیش ہے:۔

رفتارِ وقت دیکھ رہا ہوں ترا طلسم ... طوفاں سمٹ کے آج فقط رہ گیا ہے جُو
ڈھونڈے سے بھی نہ اُس کا مجھے مل سکا سراغ ... تہذیب وہ کہ جو تھی زمانے کی آبرو
میخانۂ حیات کا عالم کہوں تو کیا ... رند آج کم طلب ہیں، ساقی تہی کدو[1]

⁘

کہتے ہیں جس کو وقت فقط تیغ ہی نہیں ... ایسی یہ تیغ ہے جو سدا بے نیام ہے

⁘

لہجہ بدل گیا ہے تری گفتگو کا آج ... اس واسطے کہ آج مجھے تجھ سے کام ہے

⁘

تکمیلِ فن تلاش نہ کر میرے شعر میں! ... فن ہے وہی عظیم کہ جو ناتمام ہے

⁘

[1] از نظم "قرطبہ سے ویلنشیا تک"۔ بشکریہ "مریخ" پٹنہ

وامق جونپوری

آپ علی گڑھ کی علمی و ادبی فضا کے پروردہ ہیں۔ کشمیر میں تقریباً ۱۵ سال رہے اور ریجنل انجینئرنگ میں ڈپٹی رجسٹرار کے عہدہ پر ۱۹۶۹ء میں ریٹائر ہوئے۔ شعر و سخن کی عمدہ روایات کو اپنے فن و فکر میں جذب کرنا اُن کی خوبی رہا ہے۔ کشمیر میں آپ ادبی محفلوں کی روحِ رواں رہے۔ اور اُن کے فکر و فن کا براہِ راست یا بالواسطہ اثر کشمیر کے نوجوان شعراء پر پڑا۔ وامق عمدہ غزل کہتے ہیں۔ لیکن نظم ان کا مخصوص میدان ہے۔ نئے انداز کے مرثیہ بھی کہے ہیں۔ اسی کے ساتھ وامق اچھے نثر نگار بھی ہیں۔ نمونۂ کلام حاضر ہے:۔

میں فن کار ہوں میری انگلیاں ہیں زندگی کی نبض پر
قدم مرا زمین پر تو کائنات پر نظر

میں زندگی کا آئینہ میں زندگی کی جان ہوں
ضمیرِ عقل و ہوش ہوں، جنوں کی آن بان ہوں
کبھی میں پھول سے بھی نرم گلشنِ حیات میں!
کبھی تلاطمِ حیات کی میں اک کڑی چٹان ہوں

میں سحر ہفت رنگ ہوں، کمالِ آزری ہوں میں
نشیمنِ نگاہ و منتہائے دلبری ہوں میں

اگر اُلجھ گیا تو زلف یار بن گیا ہوں میں
سنور گیا تو سولہواں سنگھار بن گیا ہوں میں

مری زبان شاعری، مرا قلم مصوّری
طرب مرا نفس، نفس مرا صنم گری

میں فکر کا شباب ہوں، نظر کا شاہکار ہوں
سرسوتی کی لاج ہوں، سروپ ہوں، ستار ہوں

جہاں کہیں عوام کا سوال بن گیا ہوں میں
تو جابروں کی جان کا وبال بن گیا ہوں میں

عوام میری زندگی، دوام میری زندگی
شعور ہے، شراب ہے اور جام میری زندگی

— ⁘ —

کمال احمد صدیقی

آپ سرینگر میں بیس سال سے بھی زیادہ عرصہ تک مقیم رہے۔ آپ یہاں کی ادبی محفلوں کی رونق سمجھے جاتے تھے۔ لکھنؤ میں ولادت پائی۔ لکھنوی انداز اُن کے بُشرے سے ظاہر ہے۔ جوالعمری ہی سے شاعری شروع کی، اس لئے اُن کی شعری زندگی کافی طویل اور تجربہ کارانہ رہی۔ پہلے ترقی پسند تھے، پھر نئے عہد سے بھی ہم قدم ہوئے۔ اپنی فکر کی انفرادیت کی بدولت سخن سنج حلقوں میں ایک خاص مقام پیدا کر لیا۔ اسلوب، زبان اور اظہار کے انداز ان کے اپنے ہیں۔ جن میں نئے رمز اور نئی علامتوں کی بدولت اُن کی انفرادیت نمود حاصل کر لیتی ہے۔ غزل اور نظم میں رمزی انداز سے حُسنِ گفتار پیدا کرنا کمال صاحب کا خاصہ رہا ہے۔ ایک نظم کا اقتباس:۔

میرا میخانہ یہی ہے، مرا معبد ہے یہی
ہرا را ہے مرے کشمیر اتری دل آویز

یہ برف کا خزانہ ہے کہ برف کا کہسار — ایک نوخیز ترنم سے فضائیں سرشار
جب پگھلتی ہے بنا دیتی ہے پتھر زرخیز — آبشاروں کی روانی ہے مسرت انگیز

یہ ترے لالہ و گل اور بھی ہوں گے لیکن
میری محنت بھی ترے حسن میں ہے رنگ آمیز

غزل کے چند اشعار:۔

وہ ملاقات تعارف سے زیادہ تو نہ تھی — ہو گئی عشق کی تشہیر بڑی مشکل ہے
واقعی عشق کا ہونا تو بڑی مشکل ہے — لیکن اس عشق کی تفسیر بڑی مشکل ہے
اب تو ہر چہرہ ترا چہرہ نظر آتا ہے مجھے — ذہن ہے اب تری تصویر بڑی مشکل ہے

— ⁂ —

کتابیات

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	سنِ اشاعت
١	کشمیر میں اُردو (حصہ اول)	پروفیسر عبدالقادر سروری	١٩٨١ء
٢	کشمیر میں اُردو (حصہ دوم)	" "	١٩٨٢ء
٣	کشمیر میں اُردو (حصہ سوم)	" "	١٩٨٤ء
٤	احوال نامہ	ترتیب کار:- چمن لال چمن، بشیر اختر	١٩٧٩ء
٥	"تعمیر" سری نگر۔ جموں و کشمیر اردو ادب نمبر جلد ١٤، شمارہ نمبر ٢۔ اگست ٨٢ء	مدیر:- خالد بشیر	اگست ١٩٨٣ء
٦	انتخابِ اُردو ادب نمبر ٤٧ تا ١٩٧١ء (وادیٔ کشمیر)	مرتبہ: نور شاہ	١٩٧٣ء
٧	تاریخِ صحافتِ کشمیر	صوفی غلام محی الدین	
٨	تاریخِ کشمیر (فارسی)	پیر غلام حسن کھویہامی	
٩	شاعرانِ کشامرہ (فارسی)	مؤلفین "بہارِ گلشنِ کشمیر" کتب خانہ گوالیار	
١٠	رقعاتِ خاتم الکمال	لچھمی رام۔ مخطوطہ محفوظ در محکمۂ تحقیقات سری نگر	
١١	تذکرۃ الشعراء (دوم)	میر قائم	

۱۲- ادب اور سماجیات — ڈاکٹر قدوس جاوید
۱۳- نایافت — ڈاکٹر حامدی کاشمیری
۱۴- لاحروف — ″
۱۵- عروسِ تمنا — ″
۱۶- قصۂ قدیم و جدید — مخمور سعیدی
۱۷- نئی غزل — بشیر بدر
۱۸- اردو شاعری کا مزاج — ڈاکٹر وزیر آغا
۱۹- لہو لمس چنار — حکیم منظور
۲۰- ناتمام — ″
۲۱- جدید غزل — نشاط شاہد
۲۲- جدید غزل — خلیل الرحمٰن اعظمی
۲۳- معیار — ″
۲۴- جدید اُردو غزل — پروفیسر مغنی تبسم

• رسائل:

"تعمیر" سری نگر۔ "شیرازہ" سری نگر۔ "مریخ" پٹنہ۔ "شاعر" بمبئی۔ "بیسویں صدی" دہلی۔ "آج کل" دہلی۔ "کشمیر" سری نگر۔

• اخبارات:

"سفینہ" سری نگر۔ "آئینہ" سری نگر۔ "آفتاب" سری نگر وغیرہ

Allama Iqbal Library
317304